مرتّب

مالک رام

نثر ابوالکلام آزادؔ

(انتخاب)

مرتب

مالِک رام

ہریانہ اُردو اکادمی ۶۱۰ سیکٹر ۱۶ پنچکولہ (ہریانہ)

نام کتاب ——— نثر ابو الکلام آزاد
مُرتب ——— مالک رام
زیرِ نگرانی ——— کشمیری لال ذاکر، سکریٹری
باهتمام ——— ناشر نقوی، ایڈیٹر
تعداد ——— پانچ سو
سالِ اشاعت ——— ۱۹۹۲ء
طباعت ——— اے ون آفسیٹ پرنٹرز
گلی راجان، کوچہ چیلان، دہلی

سلسلہ هریانوی ادب
قیمت: ۴۷/- روپئے

کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اُردو اکادمی نے شانِ ہند پبلیکیشن، نئی دہلی سے چھپوا کر
دفتر ہریانہ اُردو اکادمی ۶۱۰ سیکٹر ۱۶ پنچکولہ (ہریانہ) سے شائع کیا۔

ترتیب

دُعائیہ

میرے لئے یہ دِلی مسرت کی بات ہے کہ گذشتہ ایک برس کے دوران ہریانہ اُردو اکادمی نے مختلف ادبی اور تحقیقی موضوعات پر چھ کتابوں کی اشاعت کی، اور اپنے رسالے "جمناتٹ" کا بھی ایک ضخیم سلور جوبلی نمبر شائع کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکادمی نے اپنے اشاعتی اقدامات سے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب "نثرِ ابوالکلام آزادؔ" اپنے موضوع اور مشمولات کے اعتبار سے ایک دستاویزی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ممتاز ادیب اور دانشور جناب مالک رام نے امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؔ کے تحریری طرز اور اسلوب کے جو نمونے پیش کئے ہیں اُنہیں پہلی بار ہریانہ اُردو اکادمی کتابی صورت میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہی ہے۔

میں اس اہم کتاب کی اشاعت پر اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس اشاعت کو بھرپور پذیرائی حاصل ہو گی۔

بھجن لال

بھجن لال

وزیرِ اعلا، ہریانہ

صدر، ہریانہ اُردو اکادمی

ابتدائیہ

ہریانہ سلور جوبلی سال کے دوران ہریانہ اُردو اکادمی نے جہاں بہت سے پروگرام منعقد کئے وہاں اہم موضوعات پر کتابوں کی اشاعت بھی کی ہے۔ سال ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۲ء تک کے دوران اکادمی سات کتابیں چھاپ چکی ہے۔ آٹھویں کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کی نثری تخلیقات کے انتخاب سے متعلق ہے۔

"نثر ابوالکلام آزاد" کے عنوان سے زیرِ نظر کتاب اُردو کی ادبی اور تحقیقی دنیا میں انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں مرتب جناب مالک رام نے مولانا آزاد کی اہم نثری تخلیقات سے جو انتخاب کئے ہیں وہ مولانا آزاد کے اسلوبِ نثر کی بہترین مثالیں ہیں۔ جناب مالک رام نے کتاب کا مقدمہ بھی بڑے تحقیقی پیرائے میں تحریر کیا ہے۔

اس کتاب کو آزاد شناسی کی ایک بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں کتاب کو بھرپور پذیرائی حاصل ہو گی۔

اے بینرجی

اے۔ بینرجی
(آئی اے ایس)
کمشنر محکمہ تعلیم حکومت ہریانہ
نائب صدر، ہریانہ اُردو اکادمی

پیش لفظ

ہریانہ اُردو اکادمی کی ہمیشہ ہی یہ کوشش رہی ہے کہ ہریانہ اور اُردو کے حوالے سے قومی تہذیب وتمدن اور ادب وتاریخ کی ترویج وترقی کے لئے بنیادی اقدامات کیے جائیں۔ ہمیں فخر ہے کہ اکادمی کی ہر پیش رفت کے لیے جہاں ہمیں حکومتِ ہریانہ کی بھرپور سرپرستی حاصل ہے وہاں محترم وزیرِاعلا جناب بھجن لال کی خصوصی دلچسپی بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

اکادمی نے ہریانہ سلور جوبلی سال کے دوران ریاست کی مجموعی ترقی میں حکومتِ ہریانہ کو بھرپور تعاون دیا اور ہر دوسرے مہینے اُردو کے نئے نئے تحقیقی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت بھی کی ہے۔

زیرِنظر "نثرِ ابوالکلام آزاد" اکادمی کی ایک تاریخی اشاعت ہے۔ اس کتاب کو اُردو کے ممتاز محقق اور دانشور جناب مالک رام جی نے ترتیب دیا ہے، جس میں مولانا آزاد کی منتخب نثری تصانیف کے اہم انتخاب شامل کیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مشمولات کے اعتبار سے اُردو میں تحقیقی کام کرنے والے طلبار کے لیے ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔

اس کتاب کا دُعائیہ وزیرِاعلا ہریانہ محترم بھجن لال جی نے اور اِبتدائیہ کمشنر مالیات اور سکریٹری محکمۂ تعلیم ہریانہ نے اکادمی کے صدر اور نائب صدر کی حیثیت سے تحریر فرماکر اکادمی کی جو سرپرستی فرمائی ہے وہ ہریانہ میں اُردو کے مستقبل کی ضمانت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو حلقوں میں اِس کتاب کو بھرپور پذیرائی حاصل ہوگی۔

کشمیری لال ذاکر

ڈائرکٹر

ہریانہ اُردو اکادمی پنچکولہ

مقدّمہ

(۱)

جیساکہ ہمیں معلوم ہے مولانا ابوالکلام آزاد کے گھرانے میں پُشتوں سے علم و فضل اور رُشد و ہدایت کی مضبوط روایت موجود تھی۔ یہ اُن کے زمانے تک قائم رہی۔ ان کے والد مولانا خیرالدین باقاعدہ لوگوں کو قادریہ اور نقشبندیہ سلسلوں میں مُرید کرتے تھے۔ "غدر" ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا خیرالدین، ملک کے سیاسی اور معاشی حالات سے دل برداشتہ ہوکر حجاز چلے گئے اور وہاں انھوں نے مکّہ معظمہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ چندے بعد ان کی مدینہ کے ایک ممتاز خاندان میں شادی ہوگئی۔ اس شادی کے نتیجے میں جو اولاد ہوئی ان میں مولانا ابوالکلام آزاد سب سے چھوٹے تھے۔ وہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔

ظاہر ہے کہ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ گھر میں گفتگو اسی زبان میں ہوتی تھی؛ اُردو بولنے کا موقع والد سے بات چیت کے علاوہ بہت کم ملتا۔ مولانا خیرالدین آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں خاندان سمیت ہندستان آئے، اور کلکتہ میں مقیم ہوئے، تو اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر دس برس کی تھی۔

ان کی تعلیم مکّہ کے قیام کے دوران ہی میں شروع ہوچکی تھی؛ اس کی تکمیل کلکتہ میں ہوئی۔ ۱۴۔۱۵ برس کی عمر میں وہ نصابی تعلیم سے فارغ ہوگئے۔ خاندانی روایات کے پیشِ نظر تعلیم مروّجہ درسِ نظامی کے علاوہ مذہبی علوم تک محدود رہی اور یہ بھی سراسر عربی اور فارسی کے ذریعے سے اور انھیں دونوں زبانوں کے متون تک۔ انھیں اُردو بحیثیت ایک

مستقل مضمون کے پڑھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔

اُردو انھوں نے اپنے طور پر حاصل کی۔ ابتدا میں ان کے اُردو سیکھنے کے دو ہی ذریعے تھے: والد سے یا ان کے ہندستانی دوستوں اور مُریدوں سے بات چیت جو ان سے ملاقات کو آتے تھے، یا پھر گھر کے ہندستانی ملازم۔ ظاہر ہے کہ کسی زبان کے سیکھنے اور اُسے صحیح طور پر بولنے اور لکھنے کے لیے یہ وسیلہ کافی نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ انھیں زبانوں سے قدرتی لگاؤ اور انھیں حاصل کرنے کا شوق تھا، اس لیے بہت تھوڑے عرصے میں اُردو میں بھی اتنی لیاقت مہیا کر لی کہ اسے بےتکلفی سے پڑھنے لگے۔ پھر حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ درسیات کی تکمیل کے بعد انھیں سب سے پہلے شعرگوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس کا اپنی کتاب " آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی " میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شاعری میں انھوں نے ظہیر احسن شوق نیموی (ف: ۲۵ نومبر ۱۹۰۴) سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا۔ شوق کی زبان و بیان پر بہت اچھی نظر تھی اور ان کی فنی معلومات اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہیں تھیں۔ اُردو ادب کے وسیع ذاتی مطالعے اور شوق نیموی کی رہنمائی اور توجہ سے مولانا آزاد کی استعداد میں روز افزوں ترقی ہوئی۔ اور وہ جلد ہی اپنے مافی الضمیر کو صحیح اور بامحاورہ اُردو میں بیان کرنے پر قادر ہو گئے۔

دوسری چیز جس نے انھیں اُردو میں مہارت پیدا کرنے کا موقع مہیا کیا، وہ اُن کی صحافت سے دلچسپی تھی۔ اگرچہ انھوں نے اپنے شاعری کے شوق کی تسکین کے لیے گیارہ برس کی عمر میں (۱۸۹۹ء) " نیرنگ عالم " کے نام سے ایک گلدستہ بھی جاری کیا، لیکن یہ زیادہ دن نہیں چلا۔ لے دے کے جملہ آٹھ شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد وہ جلد ہی نثر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں ایام میں (اواخر ۱۹۰۰ء) ایک ہفتہ وار پرچہ " المصباح " کی ادارت قبول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی بعض دوسرے جرائد میں بھی لکھنے لگے۔ ان میں مخزن (ماہنامہ) لاہور، خدنگ نظر (پندرہ روزہ) لکھنؤ، اور دو ہفتہ وار احسن الاخبار اور تحفۂ احمدیہ، کلکتہ زیادہ اہم

ہیں۔ لیکن یہ سب سرگرمیاں اور مضمون نویسی مشق اور تمرین کی ذیل میں آتی ہیں۔ ان کی وسیع اور ملک گیر شہرت در اصل "لسان الصدق" سے شروع ہوئی۔
خاندان صادق پور (پٹنہ) کے ایک ممتاز رکن خان بہادر، شمس العلماء محمد یوسف جعفری رنجور (ف: ۷ جون ۱۹۲۳ء) ہوئے ہیں۔ وہ انگریزی خوب جانتے تھے اور کسی زمانے میں انگریزوں کے قائم کردہ بورڈ آف ایگزمینرس کلکتہ میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ انگریزی میں مولانا آزاد کے استاد بھی تھے۔ ان کے مشورے اور تعاون سے مولانا آزاد نے نومبر ۱۹۰۳ء میں ایک پرچہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ اس وقت وہ بمشکل پندرہ برس کے تھے اور ابھی فارغ التحصیل ہوئے تھے۔
اسی پرچے نے انھیں ملک کے علمی اور ادبی حلقوں سے متعارف کرایا۔ اس کا متن، لب و لہجہ، مضامین کا بلند معیار، پرچے کی ترتیب و تدوین کا سلیقہ ـــــ غرض کہ ہر پہلو سے یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ جس کسی نے اسے دیکھا، اس نے یہی خیال کیا کہ اس کا مدیر کوئی سالخوردہ تجربہ کار صحافی ہے۔ ایک واقعے سے اس کا اندازہ کیجیے۔
انجمن حمایت اسلام (لاہور) اس عہد کا بہت موقر اصلاحی اور تعلیمی ادارہ تھا۔ اس کے منتظمین اپنے سالانہ جلسوں میں باہر سے مقتدر صاحب علم حضرات کو شرکت کی اور تقریر کرنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ انجمن نے اپنے اپریل ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے لیے مولانا آزاد کو لاہور آنے اور حاضرین کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت محض "لسان الصدق" میں اُن کے مضامین کے طفیل تھی۔ افسوس کہ کچھ تو ان کے اُس زمانے کے بےچین مزاج کی سیمابی کیفیت کے باعث، اور کچھ اُن کے سفروں کے زمانے میں اس کی اشاعت میں بار بار کے ناغوں کے باعث، یہ پرچہ بھی زیادہ دن نہ جیا۔ نومبر ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۰۵ء تک ڈیڑھ برس میں اس کے کل دس شمارے نکلے، اپریل/مئی ۱۹۰۵ء کے آخری مشترکہ شمارے کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔
انجمن حمایت اسلام، لاہور (۱۹۰۴ء) کے جلسے کے دوران میں ان کی ملاقات "نیرنگ خیال" ...

"وکیل" (امرتسر) کے مالک شیخ غلام محمد سے ہوئی تھی۔ اور اس ملاقات نے دوستی کی شکل اختیار کر لی۔ شیخ غلام محمد، نوجوان ابوالکلام کے علم و فضل اور گفتار و کردار سے اتنے متاثر ہوئے کہ دو برس بعد ۱۹۰۶ء میں انھوں نے انھیں امرتسر آکر "وکیل" کی ادارت کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دے دی۔ اس وقت مولانا آزاد مرحوم کی عمر یہی ۱۷ برس کی تھی۔

یہ تعلق تو چند ماہ سے متجاوز نہ ہوا کیونکہ اگلے ہی برس اُن کے بڑے بھائی مولانا غلام یٰسین آہ کا انتقال ہوگیا اور انھیں واپس کلکتہ جانا پڑا۔ لیکن امرتسر کے دورانِ قیام میں انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنا ذاتی پرچہ نکالینگے۔ الہلال کے پہلے ہی پرچہ میں لکھتے ہیں:

> سنہ ۱۹۰۶ء کے موسمِ سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشمِ بیدار نے ایک خواب دیکھا۔ انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک وہ ذہن و تخیل میں ہیں، عالمِ بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے۔ کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہوگئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ و عزم پر غالب آگیا۔ لیکن الحمدللہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیقِ الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا، یہاں تک کہ آج اس خوابِ عزیز کی تعبیر عالمِ وجود میں پیشِ نظر ہے۔ (مقالہ افتتاحیہ الہلال، ۱: ۱)

اس خواب کی تعبیر عملی شکل میں جولائی ۱۹۱۲ء میں اس دن ظاہر ہوئی، جب انھوں نے "الہلال" شائع کرنا شروع کیا۔ آج صحافی کی حیثیت سے ان کی جتنی بھی شہرت ہے، وہ حقیقت میں اسی "الہلال" پر مبنی ہے۔ "لسان الصدق" اوّل تو دس برس پرانی بات ہو چکا تھا۔ اس کے صرف دس شمارے شائع ہوئے، اور وہ بھی بہت بیقاعدگی سے، جو کسی کی یاد میں تھے، کسی کے نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ادبی جریدہ تھا۔ اس کے مقابلے میں "الہلال" اور اس کے بعد اس کا مثنیٰ "البلاغ" مجموعی طور پر

تین برس تک باقاعدگی سے ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ اس کا موضوع مذہب اور سیاست تھا۔ اسے "لسان الصدق" کی بہ نسبت ماحول بھی بہتر ملا۔ یہ ہماری سیاسی بیداری کے آغاز کا زمانہ تھا۔ اس لیے اس نے "لسان الصدق" کے مقابلے میں کہیں زیادہ شہرت حاصل کی اور اس کے اثرات بھی بہت دور رس اور ہمہ گیر اور پائدار ثابت ہوئے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آج تک اردو میں اس آن بان کا کوئی ہفتہ وار شائع نہیں ہوا۔ اس کا سائز (۲۰ × ۳۰ / ۴) ، کاغذ، ٹائپ کی چھپائی، مضامین کا بلند معیار، لب ولہجہ کی متانت، اسلوب تحریر کی بیباکی اور تہوّر، مذہبی مضامین کا انوکھا انداز، قرآن کا بدیع استعمال اور اس سے استدلال کا طریقہ، تصاویر ——— غرض کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ چند مہینوں میں اس کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ افسوس کہ یہی روشنی طبع اس کے لیے بلاے جان ثابت ہوئی۔ حکومتِ وقت اس کی آزاد نویسی برداشت نہ کر سکی۔ اس نے پہلے تو اس سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، پھر چند بعد اسے ضبط کر لیا۔ اور نازہ ضمانت کے لیے اتنی بڑی رقم (دس ہزار) کا مطالبہ کیا، جو "الہلال" کی بساط سے کہیں زیادہ تھی۔ اس پر پرچہ بند کر دیا گیا (اکتوبر ۱۹۱۴)

لیکن سال بھر بعد انھوں نے نام بدل کر اسے "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کر دیا۔ (۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء) اس پر بھی مشکل سے چند مہینے گزرے تھے کہ حکومتِ بنگال نے خود ان کے خارج البلد کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ اس پر وہ کلکتہ سے نقلِ مکان کر کے رانچی (بہار) کے مضافات میں ایک گانو (مورآبادی) میں مقیم ہو گئے۔ یہ اواخر مارچ ۱۹۱۶ء کی بات ہے۔ تین مہینے بعد ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے ان کی نقل وحرکت پر پابندی لگا کر انھیں اسی جگہ نظر بند کر دیا۔ وہ یہاں سے ۱۹۱۹ء کے اواخر میں رہا ہوئے۔

اس دوران میں گاندھی جی جنوبی افریقا سے ہندستان آ چکے تھے، اور کانگرس کی سیاسی تحریک پورے جوش وخروش سے جاری تھی۔ اسی کے ساتھ مجلس خلافت

کی داغ بیل بھی پڑ چکی تھی ۔ مولانا آزاد نے نظر بندی سے رہائی کے بعد نہ صرف ان دونوں تحریکوں کی تائید کی ، بلکہ پوری تندہی اور سرگرمی سے ان میں عملی حصّہ لینے لگے ۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمہ وقتی کام تھا ۔ اس کے ساتھ صحافت اور رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے کی فرصت کہاں مل سکتی تھی ! اس زمانے کے ان کے صرف چند خطبات ملتے ہیں ، جو انھوں نے کانگریس اور خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کے جلسوں میں دیے ۔ وقتی خطبے ، اور کسی خاص موضوع پر غور و فکر کے بعد مقالہ قلمبند کرنے میں جو فرق ہے وہ اصحاب نظر سے مخفی نہیں ۔

۱۹۲۷ء میں انھوں نے (۱۰ جون ۱۹۲۷ء تا ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء) "الہلال" دوبارہ جاری کیا ۔ لیکن اب ان کی سیاسی سرگرمیاں اس بلا کی تھیں کہ وہ نہ اس کے لیے زیادہ لکھ سکے ، نہ اس کی تہذیب و ترقی پر مناسب توجہ دے سکے ، اور پرچہ چھ مہینے بعد بند ہو گیا ۔ اس کے بعد صحافت سے ان کا رشتہ تقریباً ہمیشہ کے لیے کٹ گیا ۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں ان کی آخری کوشش 'غبارِ خاطر' کی شکل میں ظاہر ہوئی ۔ جب اگست ۱۹۴۲ء "انگریزو ! ہندستان چھوڑ دو" تحریک کا آغاز ہوا ، تو اس وقت وہ کانگریس کے صدر تھے ، دوسرے رہنماؤں کے ساتھ انھیں بھی ۹ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو بمبئی میں گرفتار کر کے قلعۂ احمد نگر میں نظر بند کر دیا گیا ۔ اگلے تین برس احمد نگر میں گذرے ۔ اس زمانے میں انھوں نے کچھ خط اور خطوط کی شکل میں بعض مضامین قلمبند کیے ، جو ان کی ۱۹۴۵ء میں رہائی کے بعد "غبارِ خاطر" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ۔

یہ ہے ان کا جملہ سرمایہ اردو نثر میں ، جو آپ دیکھیں گے ، کمیت کے پہلو سے کچھ زیادہ نہیں ۔ لیکن کیفیت کے لحاظ سے یہ اتنا گرانمایہ اور بلند پایہ ہے کہ ہم نہ صرف اسے متعدد بسیار نویس مصنفوں کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں ، بلکہ ان میں سے بیشتر پر اسے ترجیح دے سکتے ہیں ۔

(۲)

مولانا آزاد کے اسلوبِ نگارش پر اعتراض کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ 'الہلال' (دورِ اوّل) اور 'البلاغ' (۱۹۱۲ - ۱۹۱۶ء)، (بشمول "تذکرہ") کے زمانے میں انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ فارسی اور عربی کی ترکیبوں سے بہت بوجھل ہے؛ اس میں بے تحاشا تکرار ہے؛ وہ ایک ہی بات کو بار بار دہراتے اور لفظوں کے انبار لگاتے چلے جاتے ہیں، حالاں کہ اسے بآسانی دو تین جملوں میں لکھا جا سکتا تھا۔ یہ سب باتیں درست ہیں۔ اگر یہ باتیں تحریر کی خامیاں تسلیم کر لی جائیں، تو بےشک، ان کی اس زمانے کی تمام تحریریں ان عیبوں سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن اصلی بات یہ نہیں کہ انھوں نے ایسا کیا یا نہیں، بلکہ یہ کہ ایسا کیوں کیا؟

اپنے معاصر حالات اور ترکیا (عثمانی خلافت) کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر وہ ایک شذرے میں مسلمانوں کا یہ فرض بیان کرتے ہیں (الہلال ۶ نومبر ۱۹۱۲ء: ۴):

> اسلام ہر مسلمان سے اپنے آخری حق کا طلبگار ہے۔ مسلمانوں کی نمازیں اور روزے اور تمام مالی و بدنی عبادات مقبول نہیں ہو سکتیں، جب تک وہ حفظِ کلمۂ توحید و ثغورِ اسلامیہ کے لیے جان و مال سے حصّہ نہ لیں۔ پھر کوئی ہے، جو آج خدا کو اپنے نفس و مال پر ترجیح دے؟

اور اس مقصد کے حصول میں 'الہلال' کا جو رُول اور مقام ہے، اس کی وضاحت انھوں نے نئی جلد کے پہلے شمارے میں یوں کی (الہلال ۸ جنوری ۱۹۱۳ء: ۱۶):

> الہلال بھی ایک دعوت ہے جس کے تمام اغراض و مقاصد اور اصول و فروع کا نقطۂ وحید صرف اس دینِ الٰہی کی دعوت کی تجدید اور اس کے اصولِ بنیادی: "الامر بالمعروف و نہی عن المنکر" کو زندہ کرنا ہے۔ پس، گو وہ ایک ذرّۂ حقیر ہے، مگر اس کی روشنی اسی مہرِ منیر سے ہے، اور وہ گو ضعیف ہو لیکن پیغامبر اسی قوی و عزیز کا ہے۔ ونعم ما قیل:
>
> گرچہ خُردیم، نسبتے ست بزرگ　　ذرّۂ آفتابِ تابانیم

گویا "الہلال" کے ذریعہ سے وہ مسلمانوں کو اُن کے اس فرض کا احساس دلانا، اس کی طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل پیرا کرنا چاہتے ہیں۔ پس،

(۱) "الہلال" تذکیر و دعوت کا علمبردار تھا۔

(۲) اس کا مقصد دینِ الٰہی کی تجدید تھی۔

(۳) اس کا طریقِ کار "الامر بالمعروف ونہی عن المنکر" تھا۔

(۴) وہ مسلمانوں کو حفظِ کلمۂ توحید و ثغورِ اسلامیہ کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔

خود قرآن میں یہ سب مقاصد ایک آیت میں یوں بیان ہوئے ہیں:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۷: ۱۶۲)

(ان سے کہو کہ میری نمازیں اور میری عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا (غرض کہ سب کچھ) کائنات کے بنانے والے اللہ تعالیٰ کے لیے ہے)

اور اس کا ذریعہ، جیسا کہ مولانا آزاد نے کہا: الامر بالمعروف ونہی عن المنکر تھا یعنی لوگوں کو نیک اعمال کرنے کی ترغیب دلانا اور برائی سے روکنا۔ الہلال نے یہی کیا۔

دعوت و تبلیغ کی زبان وہ نہیں ہو سکتی، جو کسی ادبی انشائیے کی ہوتی ہے۔ اس میں لازماً خطابت کا انداز ہوگا۔ اثر پیدا کرنے اور اسے دماغ کے گوشے گوشے میں پہنچانے کے لیے ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائیگا۔ اس کی تشریح و توضیح کے لیے اور عبرت دلانے کے لیے تاریخی تلمیحات لائی جائینگی، گزشتہ واقعات اور آثار سے مثالیں دی جائینگی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ کہا جائیگا، اس انداز سے جو مخاطب کی تعلیمی سطح اور روایت اور ماحول کے مطابق ہو، تاکہ وہ نہ صرف اسے سمجھ سکے بلکہ اسے عبرت اور غیرت دلائی جائے اور اسے اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب ہو۔ (تکلموا الناس علیٰ قدرِ عقولھم)

اور یہ طریقۂ تحریر اور اسلوبِ بیان کچھ مولانا آزاد کی ایجاد اور ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ تمام الہامی کتابوں میں تکرار کی بھرمار ہے۔

ایک ہی مضمون کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ کہیں ایک ہی پیرایے میں، کہیں کسی دوسرے پیرایے میں۔ ویدوں اور توارت کو دیکھیے کہ ان میں کتنی تکرار ہے۔ تو قرآن کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔
بات دراصل یہ ہے کہ ان کتابوں کا مقصد محض تعلیم دینے سے زیادہ تذکیر اور راہِ ہدایت دکھانا تھا (اور درحقیقت ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہے) جہاں لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹکے، انھیں واپس بلانے کے لیے لازماً وہ سب کچھ پھر سے کہنا پڑیگا، جو اس سے پہلے کہا جا چکا تھا۔ انسانی فکر و فہم کا یہ خاصہ ہے کہ جب تک اس سے کوئی بات بار بار نہ کہی جائے، وہ اس کے دل نشین نہیں ہوتی۔ خطیب اس گُر سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو اُن کے ہاں تکرار سے اس قدر واسطہ پڑتا ہے۔ مولانا آزاد نے بھی یہی کیا۔ اگر ہم ان کے ہاں تکرار سے دوچار ہوتے ہیں، تو یہ اُن کی کمزوری اور عجز نہیں، بلکہ ضرورت اور مجبوری ہے انھوں نے جو کچھ کیا، وہ عین فطرتِ انسانی اور موقع و محل کی مناسبت کے مطابق تھا۔ پس یہ بات اعتراض کے قابل نہیں، بلکہ ان کی فراست کی دلیل ہے۔
ان کی زبان کی ثقالت بھی موردِ اعتراض رہی ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ "الہلال" مسلمانوں کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ اس کے اصلی مخاطب مسلمان، بلکہ ان میں سے بھی تعلیم یافتہ اصحاب اور علما کا طبقہ تھا۔ اس کے موضوع بھی سراسر اسلامی تھے۔ اس نے (۱) قرآن اور سنّت کی تعلیم اور (۲) ممالکِ اسلامیہ کی سیاسی اور جنگی سرگرمیوں پر خاص توجہ دی۔ اور زیادہ غائر نظر سے دیکھا جائے، تو یہ تقسیم بھی صرف سطحی ہے، بنیادی نہیں۔
اوّل، اس نے مسلمانوں کو ان کے غیر اسلامی اعمال اور معتقدات پر متنبہ کیا اور "مسلماں را مسلماں باز کردند" کے مصداق انھیں سچا مسلمان بننے یعنی نصوصِ قرآن کی روشنی میں صدرِ اوّل کے مسلمانوں کا نمونہ پیش کرنے کی تلقین کی۔
یہاں کے مسلمان نہ صرف سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر ہندستان

کی آزادی کی تحریک سے، من حیث المجموع، الگ تھلگ تھے، بلکہ سر سید نے انھیں بہت حد تک کانگریس کا مخالف بنا دیا تھا۔ لوگ ہنوز ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو نہیں بھولے تھے۔ اس کے افسوسناک نتائج بھی سب کے سامنے تھے۔ سر سید کو اندیشہ تھا کہ جس طرح 'غدر' (۱۸۵۷ء) کا نزلہ مسلمانوں پر گرا تھا اور وہ سیاسی لحاظ سے اس کے لیے ذمہ دار گردانے گئے تھے، کہیں اب کانگریس کی سرگرمیوں میں حصّہ لینے سے وہ پھر نقصان نہ اٹھائیں۔ اس میں انھیں اتنی انگریزوں کی حمایت نہیں منظور تھی بلکہ وہ دیانتداری سے اس پالیسی کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے صحیح اور مفید راہِ عمل یقین کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے کنارہ کش رہنے بلکہ اس کے خلاف اقدام کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے لیے دلائل مہیّا کیے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بمبئی اور کلکتے کے مٹھی بھر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو چھوڑ کر، عام طور پر مسلمان کانگریس کے ابتدائی دور میں اس میں شامل نہیں ہوئے۔

'الہلال' نے ڈنکے کی چوٹ اس پالیسی کی مخالفت کی۔ مولانا آزاد نے اس پر دو پہلوؤں سے اعتراض وارد کیا۔ اوّل یہ کہ اسلامی آزادی کا علمبردار ہے، وہ غلامی کی زندگی برداشت نہیں کرتا۔ پس، اگر ابنائے وطن ملک کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں، تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے، اُن کے شانہ بشانہ تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔

دوم، مشرقِ اوسط اور مغربی ایشیا کے اسلامی ممالک اس وقت تک یورپی استعماد کے چنگل سے نجات حاصل نہیں کر سکتے جب تک ہندستان آزاد نہیں ہو جاتا۔ ان اسلامی ممالک پر یورپی طاقتیں اسی لیے دانت تیز کیے ہوئے ہیں کیونکہ یہ جغرافیائی لحاظ سے ان طاقتوں اور ہندستان کے درمیانی راستے میں حائل ہیں۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ، روس وغیرہ اسلامی ممالک کو اس لیے دبائے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف فوجی یلغار کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ ہندستان اور مشرق کی دوسری مقبوضات اور نوآبادیات پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سیاسی اور مسلمہ فوجی اصول ہے

کہ اگر آپ کو منزلِ مقصود کی حفاظت منظور ہے، اور آپ اسے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں، تو اس تک پہنچنے کا راستہ اپنے قبضے میں رکھیے۔

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ 'الہلال' نے مسلم سیاست کا رُخ بدل دیا۔ وہی لوگ جو کل تک کانگریس کے مخالف تھے، اب اس میں روز افزوں دلچسپی لینے اور اس میں شامل ہونے لگے۔ اتفاق سے اسی دوران میں پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء) کے بعد یورپی طاقتوں کے خلافتِ عثمانیہ (ترکیا) کے خلاف جارحانہ رویّے کے باعث تحفظِ خلافت کی تحریک بھی شروع ہوگئی۔ اس تحریک میں مذہبی عنصر بہت نمایاں تھا اور مسلمان اس سے دینی اور جذباتی پہلو سے وابستہ تھے۔ مختلف مقامات پر خلافت کے عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں سے بعض کی صدارت مولانا آزاد نے کی۔ ان کی بعض بہترین تقریریں اسی زمانے کی ہیں۔ انھوں نے اپنے خطبات میں بار بار مسلمانوں کو خلافت کی اہمیت، اس کے پس منظر اور یورپی طاقتوں کی سرگرمیوں کے خلافِ اسلام نتائج سے آگاہ کیا، اور انھیں بتایا کہ خلافت کا مسئلہ اور ہندستان کی آزادی دراصل ایک ہی تحریک کے دو رُخ ہیں۔ پھر اگرچہ کچھ مدت (خاص کر اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کے ۱۹۲۲ء میں خلافتِ عثمانیہ کو منسوخ کر دینے) کے بعد یہ تحریک بتدریج ختم ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں کی کانگریس میں دلچسپی اور شمولیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، مسلمان پورے جوش وخروش سے اس کے بعد بھی کانگرس کے ساتھ ملک کی آزادی کی مہم میں سرگرم رہے۔

اس زمانے میں انھوں نے جو اسلوبِ تحریر استعمال کیا، وہ واقعی عربی، فارسی کے مشکل الفاظ اور ترکیبوں سے بوجھل ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کے مخاطب اور 'الہلال' کے پڑھنے والے زیادہ تر طبقۂ علما کے افراد تھے۔ یہ اصحاب اسی طرزِ تحریر کے عادی اور دلدادہ تھے۔ ان اہلِ علم نے جس گرمجوشی سے 'الہلال' کا خیر مقدم کیا، وہ آج تک حیرت انگیز ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا یہ تجربہ کامیاب رہا اور 'الہلال' کا مقصد پورا ہوگیا۔ اس کا اظہار اور اعتراف مولانا

حسرتؔ موہانی نے اپنی پوری برادری کی طرف سے یہ کہہ کر کیا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرتؔ میں بھی مزہ نہ رہا

گویا انھوں نے نہ صرف اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، بلکہ اس پر صاد کر کے انھیں اس پر قائم رہنے اور اسے آیندہ بھی جاری رکھنے کی دعوت دی۔

حالات کے ساتھ تنقید کے معیار اور اصول بدلتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے، ہم آج کے معیار کے مطابق کسی سو سالہ پرانی چیز کو درست نہ خیال کریں، یا اس پر اعتراض کر دیں۔ لیکن ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کیا اس وقت کے حالات میں یہ بات موجبِ ردّ و قدح تھی، یا حالات کا عین تقاضا۔ جب آپ "الہلال" اور صاحبِ "الہلال" کی تحریروں کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں گے، تو آپ کو اتفاق کرنا پڑے گا کہ یہی درست اقدام تھا۔ بلکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ انھوں نے غلط ذرائع استعمال کیے ہوتے۔ اس وقت آپ ان پر یہ اعتراض وارد کرتے کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ جو مقصد انھوں نے اپنے سامنے رکھا ہے، اس کے حصول کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے!

(۳)

غرض یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "الہلال" (البلاغ) بلکہ "تذکرہ" کا اسلوبِ تحریر (اسٹائل) ان کا اصلی اسلوب تھا ہی نہیں۔ اسے انھوں نے ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر اختیار کیا۔ اور جب وہ مقصد پورا ہو گیا، تو اسے ترک کر دیا۔ ان کا اصلی اور بنیادی اسلوب وہ تھا جس سے انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا کی یعنی "لسان الصدق" کی ادارت۔ یا پھر ان کی آخری زمانے کی تحریریں۔ اگر "الہلال" کا اسلوبِ تحریر ان کا اصلی اور بنیادی (اور دائمی) اسلوبِ تحریر ہوتا، تو وہ اسے روزِ اوّل اختیار کرتے اور اس پر بعد کو بھی کاربند اور عمل پیرا رہتے۔ وہ ایسا نہیں کرتے۔ وہ "لسان الصدق" سے بسم اللہ کرتے ہیں، اور "قلعۂ احمد نگر" کے زمانے میں پھر اس کی طرف رجوع کر کے ثابت

کر دیتے ہیں کہ میں دوبارہ اپنی اصل کی طرف لوٹ رہا ہوں۔

اگر یہ کہا جائے کہ 'لسان الصدق' کا ابتدائی اسلوب ترک کر کے انھوں نے 'الہلال' کا اسلوب اختیار کر لیا تھا، اور اب اس کے بعد یہی ان کا مستقل اسٹائل قرار پا گیا، تو یہ بھی ٹھیک نہیں۔ تحریکِ خلافت و کانگریس کے زمانے کی تحریروں سے قطعِ نظر بھی کر لیا جائے، تو قلعۂ احمد نگر کی نگارشات (غبارِ خاطر) ہی اس نظریے کی تغلیط کے لیے کافی ہیں۔ "غبارِ خاطر" کا اسلوب وہی ہے جو لسان الصدق میں استعمال ہوا ہے، سوائے اس کے کہ گذشتہ چالیس سال کے وقفے میں ان کے اندازِ غور و فکر میں جو ترقی اور بلوغت اور پختگی آنی چاہیے تھی، وہ اس میں نمایاں ہے، ورنہ ان دونوں تحریروں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ اور الہلالی تحریر سے تو اس کا کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر الہلالی اسلوب ان کا دائمی اسلوب بن چکا تھا اور وہ اس سے پہلا (یعنی لسان الصدق کا) اسلوب ترک کر چکے تھے، تو انھیں غبارِ خاطر میں 'الہلالی' دَور کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس وہ اسے نظر انداز کر کے پھر وہاں سے شروع کرتے ہیں، جہاں انھوں نے اسے "لسان الصدق" میں چھوڑا تھا۔ ان کا الہلالی اسلوب کو یوں کالعدم قرار دے دینا ثابت کرتا ہے کہ یہ اسلوب عارضی اور ایک خاص مقصد کے لیے تھا۔ پس، الہلالی دَور کی کوئی تحریر بھی قابلِ اعتراض نہیں۔ وہ جس مقصد کے پیشِ نظر لکھی گئی تھی، وہی اسٹائل اس کے لیے موزوں تھا۔ اگر وہ اس کے خلاف کرتے، تو بجا طور پر موردِ الزام ٹھہرتے۔

(۴)

مولانا آزاد کے الہلالی اسلوب کا ہمارے دو انشا پردازوں نے عمداً تتبع کیا: نیاز فتحپوری اور غلام رسول مہر۔ نیاز الہلال کے باقاعدہ قاری تھے۔ اس کے ابتدائی دَور میں ان کی نظمیں بھی اس میں چھپتی رہیں۔ وہ مولانا آزاد کے علم و فضل اور ہمہ گیری کے بہت قائل اور معترف تھے۔ دونوں کی ترجیحات میں بھی بہت حد تک یکسانیت تھی۔ عربی، فارسی کے کلاسیکی ادب کا وسیع مطالعہ، شعر کا صحیح ذوق اور اس کا برمحل

اور برجستہ استعمال، مذہب کا گہرا شعور اور کشادہ ذہن ـــــ یہ سب چیزیں دونوں میں مشترک تھیں۔ انھوں نے الہلال کے پانچ چھ سال بعد بعض دوستوں کے تعاون اور اشتراک سے ۱۹۲۲ء میں 'نگار' جاری کیا۔ ان کی اس زمانے کی نثر بالکل الہلالی نثر کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بتدریج اس میں اعتدال پیدا ہو گیا اور وہ ایسی نثر لکھنے لگے، جو عربی اور فارسی کی مشکل ترکیبوں کے باوجود شگفتہ اور گوارا ہو گئی تھی۔

مہر مولانا آزاد کے بہت قدیم مرید تھے۔ وہ حزب اللہ کے بھی رکن تھے۔ اُن کی مولانا آزاد سے ارادت اور نیاز مندی میں آخر تک کوئی کمی نہیں آئی۔ مہر بھی الہلالی نثر کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے یہ روش آخر تک ترک نہیں کی۔ ان کے "زمیندار" اور "انقلاب" کے اداریوں میں اور دوسرے موضوعات پر مضامین میں بھی یہ رنگ آخر تک غالب رہا۔

نثر میں شعروں کا استعمال نیاز اور مہر دونوں کی خصوصیت ہے۔

مولانا آزاد کے اسلوبِ نگارش کا ایک اور پہلو سے بھی تتبع ہوا۔

مذہبی موضوعات پر لکھنے والے مضمون نگار کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے استدلال کرے کیونکہ مذہب کی عمارت ہی ان دونوں بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کا عام اور مسلمہ انداز یہ تھا (اور بہت حد تک آج بھی یہی ہے) کہ قرآن اور حدیث کے طویل اقتباسات دے کر ان کا اردو ترجمہ اور وہ بھی پرانے انداز کی نثر میں، درج کیا جاتا، اور پھر اس سے موضوع پر دلیل قائم کی جاتی۔ پڑھنے والا بالعموم ترجمے میں اتنا الجھ جاتا کہ اس کا استدلال سے رشتہ ٹوٹ جاتا۔ اس طرح سے بیشتر حالات میں مضمون نگار کا مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا۔

مولانا آزاد نے اس میں ایک جدت کی۔ انھوں نے قرآن کا جزدان طاق سے اتار کر اُسے ہر ایک ہاتھ میں دے دیا۔ اس سے یہ خواص کی جاگیر کی جگہ، ہر کسی کی دسترس میں آ گیا۔ کوئی موضوع ہو ـــــ مذہبی، سیاسی، تعلیمی، اخلاقی ـــــ وہ دلیل اور

ثبوت میں قرآنی آیت یا اس کا ٹکڑا، حدیث کا کوئی لفظ ایسی بے ساختگی سے تضمین کر دیتے کہ جہاں اس سے اُن کے استدلال کو تقویت حاصل ہوتی، وہیں اس سے اُس ٹکڑے کے معنی اور محلِ استعمال میں گویا نئی جان اور وسعت پیدا ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا گویا آج تک وہ نص اور حدیث اس نئے معنی اور استعمال کی حامل خیال ہی نہیں کی گئی تھی۔ اور وہ یہ بدیہہ استعمال اس بیتکلفی سے کرتے کہ اس میں نہ غرابت محسوس ہوتی نہ تکلّف۔ اس طرح مذہب کے یہ دونوں بنیادی مآخذ متوسط علم والوں کے لیے بھی قابلِ فہم ہو گئے۔ لیکن افسوس کہ اس پہلو سے ان کی تقلید کرنے میں بہت کم اصحاب کامیاب ہوئے۔ دراصل اس کے لیے جس وسیع علم اور قوی حافظے اور استحضار کی ضرورت ہے، وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ پس، اگرچہ لوگوں نے اس کی تقلید تو کی، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

(۵)

اس مجموعے میں مولانا آزاد کی جن تحریروں کے نمونے جمع کیے گئے ہیں، وہ اُن کے عام اسلوبِ تحریر اور علم و فضل کی نمایندہ ہیں۔

عام طور پر انتخاب میں نمونے کے چھوٹے بڑے ٹکڑے لیے جاتے ہیں۔ عام روش کے برعکس میں نے پورے پورے مقالے شامل انتخاب کیے ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ کسی ایک موضوع سے متعلق ان کے تفصیلی خیالات معلوم ہو سکیں۔ دوسرے یہ بات بھی مدِنظر تھی کہ اس طرح ان کی بعض اہم تحریریں یکجا ہو جائینگی، اور قاری بہت ساری کتابوں کی ورق گردانی اور ان کے پڑھنے اور ان سے انتخاب کرنے سے بے نیاز ہو جائیگا۔ اس لیے یہاں ان کی نگارشات کا نمایندہ انتخاب جمع کر دیا گیا ہے۔ ان کے دل پسند موضوع چار ہیں: تصوّف، مذہب، سیاست، اور تاریخ۔ یہاں آپ ان موضوعات پر ان کی بعض مشہور اور وقیع تحریریں پائینگے۔ آخر میں چند مکاتیب اس لیے دے دیے گئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو کہ انھیں ہلکے پھلکے موضوعات پر بھی لکھنے میں کتنی قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ اردو ادب نے سیاست کی بارگاہ پر بہت بڑی قربانی پیش کی۔ اگر وہ عمر بھر ادب ہی کے لیے وقف

رہتے، تو اندازہ لگائیے کہ آج ہم کتنے مالامال ہوتے۔

آپ ان مضامین میں دیکھینگے کہ ان کی زبان سادہ اور سلیس، لیکن شگفتہ ہے۔ کہنے کا انداز براہِ راست اور غیر معمولی مشکل الفاظ سے پاک ہے۔ وہ قاری (مخاطب) کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اپنا مقصد و مدّعا کم سے کم لفظوں میں بیان کر دیں، جسے پڑھنے والا آسانی سے سمجھ سکے۔ ان مقاصد میں وہ ہر پہلو سے کامیاب ہیں۔

مقالات :

سرمد شہید : یہ ان کے عنفوانِ شباب کا مضمون ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اس کے آغاز ہی میں لکھا ہے، یہ انھوں نے خواجہ حسن نظامی (مرحوم) کے لیے لکھا تھا، اور پہلی مرتبہ خواجہ صاحب موصوف کے ماہانہ پرچے "نظام المشائخ" میں شائع ہوا۔ (جلد ۲، شمارہ ۲۔ محرم ۱۳۲۸ھ / جنوری ۱۹۱۰ء) اس کے بعد یہ متعدد دوسرے رسالوں میں بھی نقل ہوا، اور بیسیوں مرتبہ الگ سے کتابچے کی شکل میں بھی چھپا۔ ہر مرتبہ اس میں کتابت کی غلطیوں کا اضافہ ہوتا گیا، اور اب اس کا جو متن ملتا ہے، وہ بہت ہی مسخ شدہ اور ناقابلِ اعتماد ہے۔

ہم نے اسے "نظام المشائخ" کے مشارٌ الیہ شمارے سے لیا ہے۔ جہاں یہ پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ اس لیے یہاں اس کا متن بعینہٖ وہی ہے، جیسے مولانا آزاد نے لکھا تھا۔ یہ پرچہ خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ میں موجود ہے (بلکہ وہاں نظام المشائخ کا پورا فائل ہے)۔ اس کے عکس کے لیے ہم خدا بخش لائبریری اور اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے ممنون احسان ہیں۔

"نظام المشائخ" میں اسے شائع کرتے وقت خواجہ حسن نظامی (مرحوم) نے شروع میں بطورِ تعارف یہ چند سطریں لکھی تھیں:

> سرمد کی شہادت اگرچہ ہر خاص و عام میں مشہور رہے، مگر اس کے واقعات اردو زبان میں اب تک قلمبند نہیں ہوئے تھے۔ نظام المشائخ، کے شہید نمبر کے لیے

میں نے اپنے مخلص قدیمی مولانا ابوالکلام محی الدین آزاد دہلوی قادری نقشبندی سے درخواست کی کہ سرمد کا شہادت نامہ لکھ دیں۔ چنانچہ انھوں نے باوجود عدیم الفرصتی وعلالت اس کو لکھا، اور خوب لکھا۔ باعتبارِ ظاہر اردو زبان میں اس سے اعلیٰ اور شاندار الفاظ آج کل کوئی جمع نہیں کرسکتا۔ اور باعتبار معانی یہ سرمد کی زندگی موت کی بحث نہیں معلوم ہوتی، بلکہ مقامات درویشی پر ایک مستانہ اور البیلا خطبہ نظر آتا ہے۔ مولانا آزاد کا اور ان کے اوصاف کا تعارف کرانا اسی طرح دشوار ہے، جس طرح سرمد کی زندگی و شہادت کا واقعہ لکھنا مشکل تھا۔ آزاد مسلمانوں کے اس دورِ آخر میں اگلے وقت کی ذہانت وذکاوت کا مجسّم ظہور ہیں۔ اگر مسلمانوں کی قدر دان حکومتیں باقی ہوتیں، تو ہم جیسے بینوا لوگ آزاد تک کہاں پہنچ سکتے کیونکہ ان کے گرد تاجداروں کا حلقہ ہوتا۔ وہ ایک مشہور صوفی بزرگ مولوی خیرالدین صاحب قادری، نقشبندی کے صاحبزادے ہیں، جن کے اضلاع بمبئی وکلکتہ و بنگال میں ہزارہا مریدین پائے جاتے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر اُن کو پورا قابو حاصل ہے۔ تحریر کا نمونہ تو ناظرین کے سامنے ہے۔ تقریر اس سے بڑھ کر دل آویز اور جادو خیز ہوتی ہے۔ ہندوستان کے اکثر نامی جلسوں میں لوگوں نے ان کی سحر بیانی سنی ہے۔ ابھی کمسن ہیں، بظاہر اٹھارہ سالہ معلوم ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی زندگی کو ہماری خواہش پر چھوڑ دے، تو اپنے جیتے جی اُن کو کبھی نہ مرنے دیں۔

حسن نظامی

سرمد کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ اس سے متعلق جملہ معلومات میں لے دے کے چند سطروں سے زیادہ کا مواد نہیں۔ لیکن یہ مولانا آزاد کے قلم کی جولانی اور نگارش کا اعجاز ہے کہ انھوں نے اس پر بیس صفحے لکھ ڈالے۔

رُبوبیت | یہ مضمون مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (مشمولہ ترجمان القرآن) کا ایک باب ہے۔ اس میں انھوں نے اَلحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِیْنَ کی تفسیر میں خداوند تعالیٰ کی

صفت ربوبیت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ پورے تفسیری ادب میں بے مثال ہے۔ اس سے ان کے مطالعے کی وسعت اور جامعیت، مختلف مذاہب کے بارے میں واقفیت، طریقۂ استدلال اور نتائج کے استخراج پر جو روشنی پڑتی ہے، وہ ان کے علم و فضل کی بہت بڑی شہادت ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں جو لمبی لمبی عربی کی عبارتیں تھیں، میں نے انھیں حذف کر دیا ہے اور صرف ان کے اردو ترجمے پر اکتفا کیا ہے۔ عربی عبارت عام طور پر کسی کی سمجھ میں آ نہیں سکتی، لیکن اس کی موجودگی قاری کے لیے الجھن پیدا کرتی۔

قولِ فیصل ۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ترکِ موالات کا فیصلہ کیا۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں کا بائیکاٹ اسی کا حصہ تھا۔ اسی برس کے آخر میں پرنس آف ویلز ایڈورڈ (بعد کو ایڈورڈ ہشتم) ہندستان آنے والے تھے۔ حکومت کو بجا اندیشہ تھا کہ کانگریس کے اس ترکِ موالات کے فیصلے سے ولی عہدِ برطانیہ کے اس دورے پر ناخوشگوار اثر پڑے گا۔ چنانچہ اس نے تمام صوبوں کے اہم اور با اثر و رسوخ لیڈروں کو گرفتار کر کے اُن پر مقدمے قائم کر دیے اور انھیں جیل خانے بھیج دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی دیش بندھو سی۔ آر۔ داس کے ساتھ جمعہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتے میں گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر زیرِ دفعہ ۱۲۴۔ الف تعزیرات ہند (بغاوت) مقدمہ قائم کیا گیا۔ مقدمے کی چھ پیشیاں ہوئی تھیں۔ بالآخر ۹ فروری ۱۹۲۲ء کو چیف پریزیڈنسی، کلکتہ (مسٹر ڈی۔ سوینہو) نے انھیں "ایک سال قید با مشقت" کی سزا دی اور وہ جیل بھیج دیے گئے۔

کانگریس کے ترکِ موالات کے فیصلے کے پیشِ نظر مولانا آزاد عدالت کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے تھے، نہ دفاع پیش کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے یہ بیان (قولِ فیصل) لکھا اور مقدمے کی پانچویں پیشی پر (۱۷ جنوری ۱۹۲۲ء کے دن) اسے عدالت میں داخل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو گیا تھا۔ عدالت کے کام کی چیز تو انگریزی ترجمہ ہی تھا؛ وہاں

کسی کو اُردو متن سے کیا سروکار ہو سکتا تھا؟
انگریزی ترجمے کا نسخہ مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انھوں نے اپنے ہفتہ وار "ینگ انڈیا" (۲۳ فروری ۱۹۲۲ء) میں (A GREAT STATEMENT) ایک عظیم الشان بیان کے عنوان کے تحت لکھا:

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو بیان عدالت میں دیا ہے، اس کی نقل ابھی میرے پاس پہنچی ہے۔ یہ فل اسکیپ سائز کے ۳۳ صفحات پر ٹائپ کیا ہوا ہے۔ لیکن اتنا طویل ہونے پر بھی پورے کا پورا پڑھنے کے قابل ہے۔ ترجمہ بُرا نہیں ہے، لیکن میرے خیال میں اس سے بہتر ممکن تھا۔

مولانا کے بیان میں بڑا ادبی حسن ہے، اس میں پوری روانی کے ساتھ جوش بھی ہے۔ یہ بجد دلیرانہ اور جرأت مندانہ ہے، لہجہ غیر متزلزل اور مصلحت اندیشی سے عاری ہے، مگر انداز سنجیدہ اور متین ہے۔ تمام بیان میں اوّل سے آخر تک جوش اور ولولے کی کیفیت ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا مولانا خلافت اور قومیت پر جذبات سے معمور خطبہ دے رہے ہیں۔

مولانا کا بیان پڑھ کر یہ بات واضح ہو گئی کہ عدالتوں کے بائیکاٹ کی اصلی ضرورت کیا ہے! میرے خیال میں اگر ہم ایسا نہ کرتے، تو ہم میں بےخوفی اور قوت کہاں سے پیدا ہوتی، جو آج ہم میں پائی جاتی ہے۔۔۔۔ اگر ہم نے یہ بائیکاٹ نہ کیا ہوتا، تو ہمیں مولانا (آزاد) کے بیان کی سی گرانقدر اور اہم چیز کیسے حاصل ہوتی، جو بجائے خود ایک قیمتی سیاسی تعلیم کی دستاویز ہے۔

مولانا نے اگرچہ یہ بیان عدالت کو مخاطب کر کے لکھا ہے، لیکن دراصل ان کے مخاطب سارا ملک اور قوم ہیں۔ درحقیقت اس میں عمر بھر کے لیے سخت سے سخت سزا کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد مہاتما گاندھی نے اسی شمارے میں اس بیان کے انگریزی ترجمے کے چند اقتباس شائع کیے ہیں۔ ہم نے یہ مضمون اس کی پہلی اُردو اشاعت سے لیا ہے، جو بمبئی خلافت کمیٹی

نے البلاغ پریس کلکتہ میں چھپوا کر شائع کیا تھا (۱۹۲۲ء)

ہندوستان میں موسیقی | یہ دراصل ایک خط ہے (غبارِ خاطر، ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن: خط ۲۴) جیسا کہ میں نے لکھا ہے، غبارِ خاطر کے بیشتر خط مختلف موضوعات پر مضمون ہیں، ان میں صحیح معنوں میں خط کم ہیں۔ اس خط میں انھوں نے ہندستان میں (خاص کر مسلمان اکابر میں) موسیقی کے شوق و شغف اور مہارت پر تفصیل سے لکھا ہے (اسی لیے یہ خط مقالات کی ذیل میں شامل کیا جارہا ہے)

اس مضمون میں شروع سے آخر تک تاریخ کی متعدد کتابوں اور بیشمار حضرات کے واقعات درج ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قلعۂ احمد نگر میں یہ کتابیں ان کے پاس نہیں تھیں اور انھوں نے یہ سب باتیں حافظے سے قلمبند کیں۔ اس کے باوجود اُن سے کہیں غلطی نہیں ہوئی۔ اس سے ان کے مطالعے کی ہمہ گیری اور جامعیت اور حافظے کی قوت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ نیز اس سے ان کی زندگی کے اس پہلو کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ انھیں موسیقی سے کتنی دلچسپی تھی۔ اور وہ ستار بجانے میں کتنے ماہر تھے۔

غالب | یہ مقالات میں آخری مقالہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا آزاد نے الہلال میں غالب کے اُردو دیوان کے ایک خطی نسخے پر مبنی یہ مضمون لکھا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے دیوان کی بعض شرحیں تو منظرِ عام پر آچکی تھیں، لیکن ابھی تک نہ غالب کو وہ عام مقبولیت حاصل ہوئی تھی، جو بعد کو اُسے ملی، نہ اُسے اُردو کا اہم ترین شاعر ہی تسلیم کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد کا اس زمانے میں یہ مضمون لکھنا ان کے ادبی ذوق سلیم کی بہت بڑی دلیل ہے۔ خود یہ مضمون بھی اہلِ علم طبقے میں غالب سے شوق پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوا۔

خطبات | اس حصّے میں تین خطبے لیے گئے ہیں: پہلے دو کانگریس کی صدارت کے خطبے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلا خطبہ انھوں نے کانگریس کے اسپشل اجلاس، دلّی میں دسمبر ۱۹۲۳ء دیا تھا، جب ان کی عمر بمشکل ۳۵ برس کی تھی۔ وہ کانگریس کے سب سے کم عمر صدر بنے تھے، اور یہ اُن کا آج تک ریکارڈ ہے۔

یہ خطبہ گویا ان کے سیاسی مسلک کا تفصیلی بیان ہے۔ ملک و قوم اور ہندو اور مسلمانوں کا مفاد اور اتحاد کس حد تک اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے تھا، وہ اس خطبے کے ایک ایک لفظ سے پھوٹا پڑتا ہے۔ اس کے یہ الفاظ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں:

> ہندو مسلم اتحاد — یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی، بلکہ ہندستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے، کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤنگا، مگر اس سے دستبردار نہیں ہونگا۔ کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا، تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔

یہ خطبہ انھوں نے اپنے شباب یعنی دسمبر ۱۹۲۳ء میں دیا تھا۔ وہ اس کے بعد کم و بیش ۳۴ برس زندہ رہے، لیکن آخری دم تک ان کا یہی عقیدہ رہا۔ نہ انھوں نے اس سے انحراف کیا، نہ اپنے قول و فعل سے اس کے خلاف کوئی اقدام ان سے ظاہر ہوا۔ یہ ان کی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔

تیسرا خطبہ وہ ہے جو انھوں نے تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) کے بعد جامع مسجد، دلّی میں جمعہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء (۹ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ) کو دیا تھا۔ روایت ہے کہ ان کی اس تقریر کے وقت حاضرین میں سے کئی لوگ رونے لگے تھے۔ اس سے مقرر کے خلوص اور تقریر کی اثر انگیزی کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس تقریر سے مسلمانوں کو حوصلہ اور

سہارا ملا تھا۔ ان کا خوف و ہراس دُور ہوا اور وہ اپنے مستقبل کے لیے فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔
تینوں خطبوں کا متن "خطباتِ آزاد" (ساہتیہ اکاڈمی) پر مبنی ہے۔

مکاتیب: سب سے پہلے خط میں انھوں نے مولانا غلام رسول مہر کو صحافت سے متعلق کچھ ہدایات دی ہیں۔ مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے اختلافات پیدا ہو جانے پر روزنامہ "زمیندار"، لاہور سے طویل تعلقات منقطع کر لیے تھے اور اپنا ذاتی روزنامہ "انقلاب" جاری کیا تھا۔ یہ خط 'انقلاب' کی ترتیب و تدوین ہی کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ چونکہ 'زمیندار' کے مالک اور ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان سے اختلاف کی بنا پر مہر و سالک الگ ہوئے تھے، مکتوب کے آخری جملے اس کے بارے میں ہیں۔
یہ خط نقشِ آزاد اور خطوطِ ابوالکلام آزاد (حصّہ اوّل) میں ہے۔ یہ خط آج بھی اتنا ہی مفید اور قابلِ عمل ہے، جتنا ۱۹۲۷ء میں تھا۔
آخری چھ خط نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام ہیں اور 'غبارِ خاطر' سے لیے گئے ہیں۔
ان خطوط میں تفصیلات اور جزئیات پر جو توجّہ دی گئی ہے، وہ قابلِ دید ہے، خاص کر چڑا یا چڑے کی کہانی میں ان کی دقّتِ نظر کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔
انھوں نے چائے نوشی پر چٹخارے لے لے کر جو کچھ لکھا ہے، چائے کی خصوصیات، شکر کی اقسام اور اس کی تیاری کے اہتمام کی جو تفصیلات دی ہیں، اُن سے یوں محسوس ہوتا ہے، گویا ہم نے کبھی چائے پی ہی نہیں، بلکہ ہم آج تک کسی نقلی چیز کو چائے سمجھ کر پیتے رہے ہیں۔ یہ ان کی تحریر کا اعجاز ہے۔

اردو دنیا کو ہریانہ اردو اکادمی کا شکر گزار ہونا چاہیے، جس کی بدولت مولانا آزاد کی یہ تحریریں جمع ہو گئی ہیں۔ ہریانہ اردو اکادمی عزت مآب شری چودھری بھجن لال وزیر اعلا ہریانہ کی توجہ سے قائم ہوئی اور اس کی ترقی انھیں کی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ خوش قسمتی سے اکادمی کو سکتر بھی ایسا ملا جو اردو کا معروف ناول نگار اور انشا پرداز ہے۔ اس اکادمی کو ملک کے اردو اداروں میں جو نمایاں مقام حاصل ہوا ہے اس میں اکادمی کے سکتر شری کشمیری لال ذاکر کی محنت اور لگن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اللھم زد فزد

مالک رام

فہرست

مقالات: ۳۱

خطبات:

مکاتیب:

سرمد شہید

آنانکہ غم تو برگزیدند ہمہ　　در کوے شہادت آرمید ند ہمہ
در معرکۂ دو کون فتح از عشق است　　با آنکہ سپاہ او شہید ند ہمہ

خواجہ صاحب[1] مصر ہیں کہ سرمد پر کچھ لکھوں اور میرا یہ حال ہے کہ سفر میں ہوں اور اپنے حیا تکدہ یعنی کتبخانہ سے تیرہ سو میل دور ہوں۔ تاہم بعض اصرار ایسی زبانوں سے ہوتے ہیں، جن کا جواب صرف تعمیل ہی ہوتا ہے۔ مجبوراً مرقع کی جگہ خاکے کی چند ٹیڑھی لکیریں صفحوں پر کھینچ دیتا ہوں۔

عہدِ عالمگیری اور اُس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے، ان میں بالعموم سرمد کے عنوان سے بھی چند سطریں ملتی ہیں۔ لیکن اوّل تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے، تو لفافے کے لیے پورا پتہ بھی میسّر نہ آتا۔ اور پھر جو کچھ ہوں، دقت یہ ہے کہ اس وقت سامنے نہیں۔ میں نے عہدِ عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوارث و واقعات کے ضمن میں کچھ حالات مل جائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولٹیکل عاقبت اندیشیوں نے قلم کو روک لیا تھا۔ مرزا محمد کاظم نے عالمگیر کے حکم سے تمام سوانح و حالات بقیدِ سنین قلم بند کرنے شروع کیے۔ لیکن صرف دس سال

۱۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی۔

ہی کے حالات لکھے تھے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ کو خیالِ تکمیل ہوا۔ اس کے اشارے سے مستعد خان نے بقیہ چالیس سال کے سوانح قلمبند کیے اور ابتدائی دہ سالہ مجموعہ کا انتخاب شامل کر کے مآثر عالمگیری نام رکھا میں نے ۱۰۷۱ ہجری کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سن ہے مگر حالات کا ملنا ایک طرف، معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا ہے کہ اس شہیدِ عشق کے جامۂ خونچکاں کی قطرہ افشانی سے حاشیے پر کہیں دھبے نہ پڑ جائیں۔ لطف یہ کہ اسی سال شاہ عباس ثانی اور حسین پاشا رومی (غالباً والیِ حجاز) کے سفراء آئے تھے، ان کے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک پہنچ کر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں۔ خیر، یہ حالات بھی کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتے تھے۔ طرفہ تر یہ کہ اس سال نواحِ دہلی میں کہیں چند لڑکے شاہ و وزیر کی نقل کھیل رہے تھے۔ اُن میں ایک کوتوال اور ایک مجرم بھی تھا۔ مصنوعی کوتوال نے غیظ و غضب میں آ کر مصنوعی مجرم کو اصلی سزا دے دی۔ نصف صفحے کے قریب اس حادثۂ عظیم اور داستانِ الم کی نذر کیا گیا۔ مؤرخ کی نظر کا جب یہ حال ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسے قصّوں کے ہجوم میں سرمد بیچارے کی نعش کیونکر نظر آتی۔

خافی خان کی منتخب اللباب عہدِ مغلیہ کی مشہور ترین تاریخ ہے، جس نے اورنگ زیب کے حالات اس تفصیل سے لکھے ہیں، گویا صرف یہی زمانہ موضوعِ کتاب ہے۔ قیاس کہتا تھا کہ اس نے یہ واقعہ نظرانداز کر دیا ہوگا کیونکہ عالمگیری عہد کا قلم اس کے ہاتھ میں نہ تھا، جس کو ہر قدم پر روک لیے جانے کا اندیشہ ہو۔ مگر جب اُسے کھولا، تو ہزار صفحے کے سوانح میں ایک لفظ بھی سرمد کی نسبت نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا راز مؤرخ کا قلم ہے آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئی تھیں۔

سرمد کی شہادت کا وہی سن ہے، جس سن میں کوچ بہار اور آسام پر چڑھائی کی گئی۔ اس لیے دونوں تاریخوں نے اس سال کے حالات کا نصف حصّہ اسی فتحیابی کی داستان سرائی میں صرف کر دیا۔ فتحِ آسام کی اہمیت بیان میں شک نہیں۔ مگر مستعد خان کو کیا معلوم تھا

کہ تماشا گاہِ عالم میں ایسی آنکھیں بھی ہیں جو اس نظارۂ رخ پر تو غلط انداز نظر نہ ڈالینگی مگر اس غمِ اثر شکست پر ہمیشہ خونچکاں رہینگی جو ایک مجنونِ لیلائے حقیقت کو دار پر کھینچ کر معرکۂ حق پرستی میں عالمگیر کو نصیب ہوئی۔

قصہ مختصر باایں ہمہ دو کتابیں ایسی پیشِ نظر ہیں جن سے زیادہ معتبر راوی سرمد کے لیے نہیں ہو سکتے۔ پہلا شخص شیر خان لودی ہے، جو بغیر کسی واسطے کے عالمگیری عہد کے واقعات لکھتا ہے کیوں کہ اسی عہد کا تذکرہ نویس ہے۔ اس کا تذکرہ مرأۃ الخیال میرے ساتھ ہے۔ دوسرا شخص علی قلی خان داغستانی عہدِ محمد شاہ کے امرا میں سے ہے، جس نے نہایت تفحّص و احتیاط سے شعرائے فارسی کا تذکرہ ریاض الشعراء مرتب کیا اس کا قلمی نسخہ مصنف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتبخانے میں موجود ہے۔ اور زیادہ تر حالات میں نے اسی سے لیے ہیں۔ یہ گو عہدِ محمد شاہ میں لکھ رہا ہے، لیکن سرمد کے حالات کے لیے ایک واسطے سے زیادہ دور نہیں۔ اس کے علاوہ عام تذکروں نے جو کچھ لکھا ہے، ذہن میں کچھ نہ کچھ محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک بیاضِ قلمی عہدِ عالمگیر ثانی کے کسی خوش مذاق شاعر سراج الدین سراج کی جمع کی ہوئی ہے۔ اس میں کہیں کہیں حالات بھی دیے ہیں۔ چند باتیں اس سے معلوم ہوئیں۔ غرض کہ گلدستہ تو بنا، مگر چند پتّوں اور پنکھڑیوں کو دامن میں لے لیا ہے کہ مشہدِ سرمد پر جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں۔

(ابو الکلام آزاد)

سرمد کی اصل قومیت اور مذہب کو کوئی صاف نہیں بتلاتا۔ مصنفِ مرأۃ الخیال کا بیان ہے کہ "اصلش از فرنگستان دار منی بود" مگر باقی تذکرے یہودی الاصل بتلاتے ہیں۔ والہ داغستانی اس پر اتنا اور بڑھاتا ہے کہ وطن کاشان تھا۔ مگر یہ اختلاف باہم متناقض نہیں کیوں کہ ایران میں قدیم سے ارمنیوں کی وسیع آبادی موجود ہے، جو بالعموم مسیحی اور بعض یہودی ہیں۔ اب تو انھوں نے یکسر یورپین طرزِ معاشرت اختیار کر لی ہے اور تحصیلِ علومِ جدیدہ میں تمام ایرانی جماعتوں سے پیشرو ہیں۔ مگر ایک صدی پیشتر تک

ان میں مذہب کے سوا کوئی بات مسلمانوں سے مختلف نہ تھی۔ ان میں سے بعض اسلامی علوم و آداب کو اس حد تک حاصل کرتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیمیافتہ صحبتوں میں شریک ہو سکتے تھے۔ چنانچہ تذکروں میں متعدد شعراء کے حالات ملتے ہیں، جو ارمنی اور مسیحی تھے۔ مگر ان کے اشعار ایران کے مسلمان خوشگو شعراء کے کلام سے کسی طرح کم نہیں۔ سرمد کا خاندان بھی ارمنی اور یہودی ہوگا کاشان میں متوطن ہونگے۔ ارمنی ہونے کی وجہ سے لوگوں کو خیال پیدا ہوا ہوگا کہ فرنگی ہے اور ایک باہر کے غیر معروف آدمی کی نسبت ایسا دھوکا ہونا، کچھ عجیب نہیں۔

آفتاب جب چمکتا ہے، تو باغ و چمن کو نہیں ڈھونڈھتا کہ اپنی کرنوں کا انھیں نشیمن بناؤں۔ اس کا فیضان ضو بخش مبدء فیاض کی طرح فیضِ عام ہے۔ محلسرائے شاہی کے کنگروں کے طلائی کلس اگر اس کی ضَو فشانی سے چمک اُٹھتے ہیں تو کیا جنگل کے خشک درختوں کی شاخوں پر سنہری رنگ نہیں چڑھ جاتا۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میرا مقصد نظام شمسی کے مرکز سے نہیں بلکہ آفتاب اسلام سے ہے۔ اِس آفتابِ قدس تجلّی کی لہریں اُٹھیں، تو انھوں نے پہلے تو جسم و خون اور قوم و مرز بوم کے قائم کیے ہوئے امتیازات کو خس خاشاک کی طرح بہادیا۔ پھر سیرابی کا وقت آیا، تو احرارِ **قریش اور ارقاے** حبش، بطحاو یثرب، اور عجم و فرنگ تاجدارِ داغستان اور بادیہ نشینِ عرب، **ادنیٰ و اعلیٰ** دور و نزدیک سب کو یکساں طور پر شریکِ فیض کیا۔ صرف صلاحیت اور اثر پذیری معیارِ فیض رسانی تھی کہ ہر قوم اور ہر زمین بقدرِ صلاحیت حصہ یاب ہوئی۔ بوجہل قریشی تھا اور خزانے کے پاس، مگر مدّت العمر محروم رہا۔ بلال حبشی اور صہیب رومی تھا پھر کس قدر دُور، مگر ان کے دامن دیکھیے تو مالامال تھے۔ ابرِ کرم کہاں نہیں برستا؟ مگر ہر زمین لالہ زار نہیں بن جاتی ؎

توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ اسی فیاضانہ فیض بخشی کا نتیجہ تھا کہ عرب گو مبدا و منشا اسلام تھا، مگر اُس کی کوئی خصوصیت نہیں رہی۔ نومسلم قومیں جو دُور دراز ملکوں سے آتی تھیں، ہر علم و فن میں اس طرح دست برعلم

ہوئیں کہ خود عرب کو ان کے لیے اپنی صفیں توڑ دینی پڑیں۔ یہاں تک کہ آج تراجم و رجال کی کتابیں اٹھا کر دیکھتے ہیں، تو کوئی علم و فن ایسا نظر نہیں آتا جس پر نومسلم قوموں کا تسلط نہ ہو حتیٰ کہ فقر و تصوف جس کی مذہب کے تالے میں پرورش ہوتی ہے، اس کی تاریخ بھی نومسلم اشخاص کی خود فروشیوں کی منت پذیری سے آزاد نہیں۔ بات یہ ہے کہ خدا کی محبت کی طرح اسلام کی بے دریغ فیض بخشی بھی اس طرح عام تھی کہ نسب و قومیت کے امتیازات کو اس میں دخل نہ تھا۔ محرم کی سبیلیں جب لگائی جاتی ہیں، تو پیاسوں کی تلاش ہوتی ہے، زرّیں کلاہوں اور ریشمی قباؤں پر نظر نہیں پڑتی۔ سرچشمۂ فیضان الٰہی بھی تشنگان محبت کو ڈھونڈتا ہے۔ نسب و قومیت اور رنگ و خاندان سے اسے کیا سروکار!

اس عام فیض بخشی کی ایک نمایاں نظیر سرمدؔ کی سوانح عمری بھی ہے۔ وہ ایران کے کسی ارمنی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مذہباً یہودی یا مسیحی تھا۔ آغازِ عمر ہی میں فیضانِ الٰہی کی نظرِ انتخاب پڑی اور جذبِ ہدایت کی کشش نے مشرف باسلام کیا۔ خاندانی نام کا پتہ نہیں چلتا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد کیا نام رکھا گیا۔ عام طور پر صرف سرمدؔ ہی کے لقب سے تذکروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور سچ یہ ہے سرمدؔ کا بے نام ہونا جائے تعجب نہیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی شرع میں بے نام و نشانی تو رُکنِ اوّلین، بلکہ شرطِ ایمان ہے ؎

با وجودت ز من آواز نیامد کہ منم

لیکن بعض تذکروں میں "سعیدائے سرمدؔ" کے عنوان سے اس کے حالات درج کیے گئے ہیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اسلامی نام کا ایک جزو شاید لفظ سعید ہوگا، جو بقاعدۂ تخفیف تخلص کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

تحصیلِ علمی کا حال معلوم نہیں۔ لیکن تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل اور عربیت میں درجۂ کمال رکھتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تحصیلِ علمی اس زمانے کے نصاب کے مطابق کامل ہوگی۔

ابتدائی پیشہ تجارت تھا۔ ایران سے تجارتی اموال لے کر ہندستان کی طرف بڑھا کہ اس

زمانے میں علم و فن کی طرح جنس و متاع کی بھی نمایش گاہ ہندوستان تھا۔ مگر یہ جوان تاجر جو بیخبرِ ہندوستان کی طرف قدم سراں تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر کس تجارت میں اسے اپنا تمام سرمایہ لگا دینا پڑیگا۔ وہ شاید ایرانی مصنوعات فروخت کر کے ہندوستان کی قیمتی اجناس اور محسودِ عالم کانوں کے لعل و الماس خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ قضا و قدر اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے۔ تجارت تو اسے بہرصورت آخرِ حیات تک کرنا پڑیگی مگر زخارفِ مادے کی تجارتگاہوں میں نہیں، بازارِ حسن و عشق میں، جہاں چاندی سونے کی جگہ دلِ صد پارہ اور جگرِ زخم خوردہ کا سکہ رائج ہے، اور جہاں کی تجارت یہ ہے کہ صبر و شکیب، ہوش و خرد، دل و جگر دے کر ایک غلط انداز نظر، ایک چینِ جبیں، ایک تغافل پیشہ نگاہ خرید لیجیے کہ اس سہل قیمت پر یہ متاع مشکل مفت ہے ؎

صد ملکِ دل بہ نیم نگہ میتواں خرید
خوبان درین معاملہ تقصیر می کنند

اور صرف اتنا ہی نہیں کیوں کہ یہ تو اس بازار کی نمایشی اور سامنے کی چہل پہل ہے۔ اگر ہمت قدم آگے بڑھائے تو پھر وہ آخری سودا بھی کرنا پڑیگا جس کی قیمت نقدِ جان ہے اور جس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ حیات کا لبریز پیمانہ خونِ شہادت کے ایک لبریز جام سے بدل لیا جاتا ہے۔ اور ثمن بخس کے معاوضہ میں اگر یوسف ملے، تو کون خیرہ نظر ہے جو اس متاع کا مشتری نہ ہو؟ ؎

دو عالم نقدِ جان بر دست دارند
بہ بازارے کہ سودائے تو باشد

اس زمانے میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہوکر ہندوستان آتے تھے۔ سندھ کے شہروں میں ٹھٹھ ایک مشہور شہر تھا، جس کو اب نئے جغرافیہ میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے۔ یہی ٹھٹھ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمد کے لیے تجلی گاہِ ایمن بنا اور لیلائے حسن نے اوّل اوّل اپنے چہرے سے نقاب الٹی۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا جس کی چشمِ کافر نے یہ افسوں طرازی کی اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں، کیوں کہ عشق خیز دلوں کو دو نیم کرنے

ہیں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں۔ یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پروا و بے نیاز، مگر صاحبِ جنس غرضمند ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ کہ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرزِ نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈھتے ہیں، انھیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاعِ دل کی کس مپرسی سے تنگ آ گیا تھا اور خود خریدار کو بیتابانہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کے آیا ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاعِ ارزاں کی ایک چشمِ سحر کار طالب ہے، اور بلا تامّل یہ سودا منظور کر لیا ؎

دلالِ عشق بود و خریدار جانستاں

خود را فروختیم، چو سودا بما رسید

سرمد کو آیندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی، یہ اُس کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور کچھ سرمد ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی عنوان ہو، منزلِ حقیقت کا کیا ذکر، عشق تو وہ دروازہ ہے کہ جس سے گزرے بغیر انسان، انسان نہیں ہو سکتا۔ جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں، اس کو معنیِ انسانیت سے کیا واسطہ! تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہدِ معتکف بھی با ایں ہمہ تعبّس و تقشّف جب اپنے زاویۂ عبادت میں سرزانو ہوتا ہے، تو حور و غلمان کی مسکراہٹ سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈھتے ہیں، انھیں بھی اس تصوّر کے بغیر چارہ نہیں ؎

حورِ جنّت جلوہ بر زاہد دہد، در راہِ راست

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہی وجہ ہے کہ جو سوداز دگانِ حقیقت شاہدِ ازلی کے جان دادہ ہیں، انھیں بھی عشقِ مجازی کے کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے۔ کیوں کہ دل جب تک لذّتِ آشنائے درد نہ ہو، برف کی ایک قاش ہے جس کو پانی بنتے دیکھا ہے، مگر آگ میں جلتے ہوئے

کبھی نظر نہ آئی ۔ حال آنکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے اور عشق کا کلیسا آتشکدہ ہے ۔ یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں، جو اپنے دلوں کو اس آتشکدے پر نذر چڑھا دیں اور پھر دامن سے ہوا بھی دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے ؎

افسردہ را نصیب نباشد دل کباب
آں یا بد ایں نوالہ کہ مہمان آتش است

عشقِ الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسوا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں ۔ مگر انسان آب و گِل تعلّقات میں اس طرح پا بہ گِل ہے کہ جب تک دل پُر درد کی کوئی محکم چوٹ نہ لگے، اُدھر سے ٹوٹ نہیں سکتا ۔ مکھی جب شہد پر بیٹھ جاتی ہے، تو جب تک اُڑائیے نہیں نہیں اُڑتی ۔ انسان کا دل بھی جب تک چوٹ نہ کھائے، دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا ۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے ۔ عشق ہی کا فرشتہ اپنے بازوؤں میں وہ مافوق الفطرت طاقت رکھتا ہے کہ اس کی تیغ کا پہلا ہی وار خون کی تاروں سے بندھے ہوئے رشتوں اور دنیا کی دل فریبیوں کی جکڑی ہوئی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے ۔ اور دل جب ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو حلقۂ ازل کے سوا اور کوئی بیڑی پاؤں میں نہیں ہوتی ۔ اسی درد کے لیے عارف عطّار بے قرارانہ فغاں ساز ہے کہ ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرہ دردے دل عطّار را

غور کرو جس مُردہ دل کو کبھی یہ وقتِ خوش نصیب نہ ہوا کہ کسی بندِ نقاب کے ٹوٹنے کے تصوّر میں اپنے خرمنِ ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے، اس کو شاہدِ حقیقت کا نظارہ حواسِ ظاہری سے کب کھو سکتا ہے؟ جس افسردہ نفس نے اپنی عزیز اور شیریں راتیں کسی نرگسِ خواب آلود کی یاد میں نہ کاٹی ہوں، اس کو معشوقِ حقیقی کی یاد میں بیچین راتیں کب نصیب ہوں؟ جس خیرہ دماغ نے اپنے سرمایۂ عجز و نیاز کو کسی مغرورِ ناز کی کج اداؤں اور بے نیازیوں پر نثار نہ کر دیا ہو، وہ خود پسندی اور وجود آرائی کے بُت کو کیوں کر توڑ

سکتا ہے؟ جس بحیس کو کسی پیکرِ حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت اور لا یعقل نہ کر دیا ہو، اس کو سازِ ازل کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے۔ غرض کہ جس بدنصیب کو کسی مستِ حسن کی نگاہِ بے محابا بیخود نہ کر سکی، اُسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا؟ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو، وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئے فتیلے کو بہت دیر تک آگ دکھلانی پڑتی ہے ؎

محبّت با دلِ غم دیدہ، الفت بیشتر گیرد
چراغی را کہ دُودے ہست در سر زود تر گیرد

نظر بس اگر جویائے حسن ہیں تو روئے پنہاں کے نظارے کی کیوں منتظر ہیں؟ انھیں تو پردۂ نقاب کی زیبائی ہی پر لوٹ جانا چاہیے۔ کنعان کی گم کردہ بسر آنکھوں نے جلوۂ یوسفی کا انتظار نہیں کیا۔ پیراہنِ یوسفی کی بُو پاتے ہی آنکھیں کُھل گئیں کہ اِنّی لَاَجِدُ رِیحَ یُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۔[۱] یہی وجہ ہے کہ میخانۂ حقیقت میں جب مجلس گرم ہوتی ہے، تو پہلے جام و مینا کا دَور چلتا ہے۔ اور جب اس کے تلخ گھونٹ گوارا ہو جاتے ہیں، تو پھر خود ساقی اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیتا ہے کہ اب جام و سُبو کی ضرورت نہیں، اس کی نگاہِ نشہ خیز سے خود رفتگی و خود گذشتگی حاصل کیجیے ؎

مے حاجت نیست مستیٔ ام را
در چشمِ تو تا خمار باشد

سرمد کے آگے بھی یہ جام رکھا گیا۔ اور جام کی خوبی بہت کچھ جام پیش کرنے والے ہاتھ کی رعنائی پر منحصر ہے۔ اس لیے ہم اس ہندو لڑکے کو بھولنا نہیں چاہتے، جس کی نگاہِ لیلیٰ وش نے سرمد کو مجنوں بنایا۔ مگر افسوس کہ ہر عاشق قیس و فرہاد کی قسمت کو کہاں سے لائے! سرمد کی لیلیٰ کا زیادہ سے زیادہ حال جو معلوم ہوتا ہے، یہی ہے کہ ایک ہندو لڑکا تھا! دُ

---

[۱] اگر تم یہ نہ کہو کہ اس کا دماغ چل گیا ہے تو مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

(یوسف ۱۲: ۹۴)

غور کیجیے، تو یہ بھی بہت ہے کیوں کہ بازارِ عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے، تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے اور کیا قیمت مل رہی ہے؟

مرا فروخت محبّت درے نمیدانم
کہ مشتری چہ کس است و بہاے ما چند است

اربابِ تذکرہ اس میں بھی ہم آہنگ نہیں کہ یہ واقعہ کہاں ہوا۔ والہ داغستانی لکھتا ہے کہ بندر سورت میں اور آزاد بلگرامی نے اپنے کسی تذکرے میں عظیم آباد پٹنہ لکھا ہے لیکن ان سب میں مرأۃ الخیال قدیم العہد ہے اور اس کا بیان ہے کہ "در اثناے تجارت بشہر تتہ اُفتاد، بر ہندو پسرے عاشق گشت" اس لیے ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بہر کیف بجلی کہیں گری ہو، دیکھنا یہ ہے کہ دہقان کے خرمنِ سوختہ کا کیا حال ہوا۔

عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں۔ ہر عاشق گو قیس نہ ہو، مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے۔ اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذبِ جنون اس طرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاعِ تجارت بھی غارت کر دیا۔ دنیوی تعلقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی، بالآخر اس بوجھ سے بھی پاؤں ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو مدعیانِ ہشیاری کے لیے ہیں مجنون لایعقل مرفوع القلم ہوتے ہیں ؎

خطا بر دمِ دیوانہ کس نمی گیرد
جنوں نداری و آشفتہ خطا اینجاست

بیابان نوردی عالمِ عشق کی سیر و سیاحت ہے کہ اسی سے انسان کی عقل تجربہ کار و پختہ ہوتی ہے۔ "مجنوں" جو صفِ عشاق میں نمایاں نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ صحرا گردی میں کوئی اس کا حریف نہیں۔ سرمد نے بھی مدتوں صحرا کی خاک چھانی۔ سندھ کے ریگزاروں پر تلوے گرم کیے۔ ہندوستان کے گرم و سرد موسموں کو یکساں عریانی میں کاٹ دیا اور بالآخر جب یہ عقدہ کھلا کہ ؎

بیہودہ چرا در طلبش می گردی   بنشیں! اگر او خداست خود می آید

تو پھر ایک مستقر کی تلاش ہوئی، جہاں بیٹھ کر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کیا جائے لیکن جب نتیجہ یہی تھا تو پھر یہ بیاباں نوردی کیوں تھی؟ مگر نہیں خود کہہ چکا ہوں کہ یہ بھی عشق کے قانون کمال میں داخل ہے اور عشق کے قانون میں ؎

یکی از دستگیری ہائے عشق است
عزیزان را بخواری برکشیدن

یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساطِ ہند پر عالمگیر ایک نئی چال چلنے والا تھا۔ اور شاہجہانی حکومت کا عہدِ آخری اور شہزادہ داراشکوہ ولی عہدِ سلطنت تھا۔ سلسلۂ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت اور دماغ کا شخص گذرا ہے۔ اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخِ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اس لیے اصلی تصویر پولٹیکل چالوں کے گرد وغبار میں چھپ گئی۔ وہ ابتدا سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا اور ہمیشہ فقرا اور اربابِ تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات، جو دست بُردِ حوادث سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا خود بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں۔ اُس کے صاحبِ ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاشِ مقصد میں دَیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی، اور جس نیاز کیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں کے ساتھ رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحبِ حال اختلاف کرسکتا ہے کیوں کہ اگر اس عالم میں بھی کفر و اسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا؟ پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیے۔ اگر صرف شمعِ حرم ہی کا شیدا ہے، تو سوز طلبی کامل نہیں۔

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر
پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

سرمد جوشِ جنون میں پھرتا ہوا جب شاہجہان آباد دہلی پہنچا، تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لیے جائیں کیوں کہ جس جام کی تلاش ہے، وہ اسی میخانے میں ملیگا۔ مصنفِ مراۃ الخیال جو عالمگیر پرستی کے معبد میں صفِ اوّلین کا طالب ہے۔ لکھتا ہے کہ "چوں خاطرِ سلطان داراشکوہ

بجانبِ مجانین میل داشت، صحبت بوے درگرفت "۔ بیچارہ علی شیر ابھی ہوشیاری و دیوانگی ہی کی بحث میں سر مار رہا ہے۔ اسے کیا خبر کہ دنیا میں ایسی ترازو بھی ہیں، جن کے ایک پلّے میں اگر دیوانگی رکھ دی جائے، تو دوسرا پلّہ تمام عالم کی ہوشیاری رکھ دینے سے بھی نہیں جھک سکتا۔ اور پھر ایسے خریدار بھی ہیں جن کو اگر ہوش و حواس کا تمام سرمایہ دے دینے سے ایک ذرہ جنون مل سکتا ہو تو بازارِ یوسف کی طرح ہر طرف سے ہجوم کریں۔ بہر کیف خواہ کچھ ہو عالمگیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں دارا شکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغِ ہوشیاری کشتگانِ حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کی رگہائے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ شاید دارا شکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا۔ اسی لیے اس نے سرمد جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔

غرض کہ سرمد دارا شکوہ کی صحبت میں رہنے لگا، اور اسے بھی سرمد سے کمال عقیدت تھی۔ اُس زمانے میں عشق کی شورش انگیزیاں کبھی کبھی اُسے باہر نکلنے پر مجبور کرتیں۔ لیکن چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ آخری امتحان گاہ یہی ہے، اس لیے شاہجہاں آباد سے نکل نہیں سکتا تھا، یہاں تک کہ شاہجہان کی علالت اور دارا شکوہ کی نیابت نے عالمگیری ارادوں کے ظہور کا سامان کر دیا اور ایک عرصے کی شورش اور خونریزی کے بعد ۱۰۶۹ھ میں عالمگیر اورنگ نشینِ حکومت ہوا۔ یہ زمانہ دارا شکوہ کے ساتھیوں اور ہمنشینوں کے لیے خود دارا شکوہ سے کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو دارا شکوہ کے ساتھ نکل گئے اور جو رہ گئے، انھوں نے اپنے آپ کو کشتیِ طوفان میں پایا۔ لیکن اس رہنِ بیخبری کو اپنے استغراق میں اس کی فرصت کہاں ملتی تھی کہ دنیا کو نظر اٹھا کے دیکھے۔ اور اگر دیکھتا بھی، تو وہاں سے کیونکر نکلتا کیوں کہ بایں ہمہ بیخبری اس سے بیخبر نہ تھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے عشق کی ابتدائی منزلیں تھیں۔ آخری منزل طے کرنی باقی ہے اور وہ یہیں پیش آنے والی ہے۔

بیک دو زخم کہ خوردن ز عشق ایمن مباش ۔۔۔ کہ در کمیں گہ ابرد کمانکش است ہنوز

سرمد کی شہادت کے اسباب تذکرہ نویسوں نے مختلف بتلائے ہیں۔ تذکرہ مرأۃ الخیال میں ہے کہ سرمد کی اس رباعی پر جبّہ پوشانِ شرع کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے اسے کفر قرار دیا کہ معراجِ جسمانی سے انکار لازم آتا ہے ؎

ہر کس کہ سرِّ حقیقتش پا در شد … اُو پہن تر از سپہر پہناور شد

ملّا گوید کہ بر فلک شد احمدؐ … سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد

مگر اس ترکِ سادہ کو فقیہانہ جنگ و جدل سے کیا سروکار تھا۔ اس نے نظر اُٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ یہ کور بصر کیا شور و غوغا کر رہے ہیں! وہ تو اس عالم میں تھا جہاں اِن اقرار و انکار کی بحثوں کی بھی آواز نہیں پہنچ سکتی ؎

در عجائب ہائے طورِ عشق حکمت ہا کم است

عقل را با مصلحت اندیشیِ مجنوں چہ کار

لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی، اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے۔ اور ہزاروں خوں ریزیاں جو پولٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں، انھیں مذہب ہی کی چادر اُڑھا کر چھپایا گیا ہے۔ جب اور کوئی بہانہ نہ ملا تو عُریانی و برہنگی کو کہ خلافِ رسمِ شرع ہے، بنیاد قرار دیا۔ اور مذکورۂ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراجِ جسمانی کا منکر ہے۔ ملّا قوی اس زمانے میں قاضی القضاۃ تھے۔ عالمگیر نے انھیں سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی کی وجہ دریافت کریں۔ ملّا صاحب نے کہا کہ باوجودِ کمالِ علم و فضل برہنہ و مکشوف العورۃ رہنا کس عذر پر مبنی ہے۔ سرمد نے کہا۔ کیا کروں، شیطان قوی ہے۔ اور فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی ؎

خوش بالای کردہ چنیں پست مرا … چشمے بدو جام بُردہ از دست مرا

او در بغل منست و من در طلبش … دُزدے، عجیبے برہنہ کردہ است مرا

ملّا صاحب برہم ہوئے۔ اور برہم ہونے کی بات ہی تھی کیوں کہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی، مگر خود اُن کے وجودِ اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی۔ یعنی اُن کا اسمِ سامی ابلیس لعین

کا وصف قرار پایا۔ بہر کیف انھوں نے عالمگیر سے آکر کہا کہ کفر کا کافی مواد ہاتھ آ گیا ہے اور قلمدان کھولنا چاہا کہ علمائے ظاہر کی تیغ خون آشام ابھی نیام میں رہتی ہے۔ لیکن عالمگیر کی عاقبت اندیشیوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہ سمجھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخص نہیں ہے، جس کا قتل ایک عامتہ الورود واقعہ سمجھا جائیگا۔ علم و فضل کے لحاظ سے کوئی اس کا ہمتا نہیں اور رجوعِ خلائق کا یہ حال ہے کہ سارا شاہجہان آباد اس کا معتقد اور ہوا خواہ ہے۔ اس لیے جب تک کوئی بہانہ قوی ہاتھ نہ آئے، اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہیے۔

اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغِ بے نیام رہا ہے۔ اور ہزاروں حق پرستوں کا خون اُن کے فتووں کا دامنگیر ہے۔ اسلام کی تاریخ کو خواہ کہیں سے پڑھو، مگر سینکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ بادشاہ جب خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتا کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے۔ صوفیہ اور اربابِ باطن پر منحصر نہیں، علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بین اسرارِ حقیقت کے قریب ہوئے، فقہا کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور بالآخر سر دے کر نجات پائی۔ سرمد بھی اسی تیغ کا شہید ہے ؂

چوں میرود نظیری خونین کفن بحشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں دادخواہ کیست

آخر الامر یہ قرار پایا کہ سرمد کو علما و فضلائے عصر کے مجمع میں طلب کیا جائے اور تمام علما کی جو رائے قائم ہو، اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ مجلس منعقد ہوئی، اور سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے خود عالمگیر مخاطب ہوا اور پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں سرمد نے دارا شکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا، کیا یہ سچ ہے؟ سرمد نے کہا ہاں، اور وہ مژدہ درست نکلا کہ اُسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ عمامہ بندوں نے کہا کہ برہنگی شرع کے خلاف ہے، اور اس کے لیے صاحبِ عقل و تمیز کا کوئی عذر مسموع نہیں۔

اس کا جواب تو سرمد پہلے ہی دے چکا تھا۔ ع

دُزدے عجیبے برہنہ کردہ است مرا

خلیفہ ابراہیم بدخشانی اواخرِ عہدِ عالمگیری میں ایک صاحب طریقت بزرگ گذرے ہیں، جو ابتداے جوانی میں سپاہی پیشہ تھے اور فتح اللہ خان کے ہاں کہ امراے عالمگیری میں سے تھا، نوکر ہوگئے تھے۔ اتفاقاً میر جلال الدین بدخشانی نامی ایک صاحب حال بزرگ کی ان پر نظر پڑگئی اور اُن کو فیض پذیر دیکھ کر اپنی تربیت میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی صاحبِ حال ہو گئے۔ علمِ ظاہری کی تحصیل کا گو موقع نہ ملا، لیکن مذاقِ فطری کا یہ حال تھا کہ مثنوی معنوی کا دفترِ ہفتم چار حصّوں میں نظم کیا جو درد و کیفیت سے لبریز ہے۔ معزالدین جہاندار شاہ کو ان کی خدمت میں کمال اعتقاد تھا اور ہندوستان و دکن میں ہزاروں اشخاص ان کے معتقد و حلقہ بگوش تھے۔

والہ داغستانی انھیں بزرگ سے روایت کرتا ہے کہ جب مجمع علماء میں سرمد کو لباس پہننے کے لیے کہا گیا اور مسموع نہ ہوا، تو بادشاہ نے علماء سے کہا کہ محض برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ اس سے کہا جائے کہ کلمۂ طیبّہ پڑھے۔ اور یہ اس لیے کہا کہ بادشاہ سن چکا تھا کہ سرمد کی عادات عجیبہ میں سے ایک یہ عادت بھی ہے کہ کلمۂ طیبّہ پڑھتا ہے، تو لاالٰہ سے زیادہ نہیں کہتا۔ علماء نے سرمد سے کلمۂ طیبّہ پڑھنے کی خواہش کی تو اپنی عادت کے بموجب صرف لاالٰہ پڑھا کہ جملۂ نفی ہے۔ اس پر علماء نے شور مچایا تو کہا ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات تک نہیں پہنچا۔ اگر الّا اللہ کہونگا، تو جھوٹ ہوگا۔ اور جو دل میں نہ ہو وہ زبان پر کیسے آئے؟ علماء نے کہا ایسا کہنا کفرِ صریح ہے۔ اگر توبہ نہ کرے، تو مستحقِ قتل ہے۔ یہ ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و ایمان کی بحثیں سُنائی جائیں، اور قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو۔ یہ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اِس کی کرسی کتنی اونچی ہے۔ اور وہ اُس منارۂ عشق پر تھا، جہاں کعبہ اور مندر بالمقابل نظر آتے ہیں، اور جہاں کفر و ایمان کے علم ایک ساتھ لہراتے ہیں ؎

کشورے ہست کہ درد ے رود از کفر سخن   ہمہ جا گفت و شنو بر سرِ ایمان نزود

سرمد نے تو اپنی حالت بے کم وکاست بیان کر دی تھی۔ ایمان بالغیب پر جو لوگ قانع نہیں ہوتے (اور اس عدم قناعت ہی کا نام تلاشِ حقیقت ہے) وہ اپنے اقرار کو مشاہدہ عینی سے استوار کرنا چاہتے ہیں اور شاہدِ حقیقت کی رونمائی نقدِ شہادت ہے، جو ابھی سرمد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ پس جس چیز کو دیکھا نہ تھا کیوں کر کہتا کہ "ہے"؟ "اس ملک کے جتنے رہرو ہیں، سب ہی کو اس منزل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن سرمد کا جُرم یہ تھا کہ وہ جس جام کو چھپ کر پیتے ہیں، سرمد نے علانیہ مُنھ سے لگایا اور دُرّہ محتسب کا مستحق ٹھہرا ؎

خرقہ پوشاں ہمہ گر مست گذشتند، گذشت
قصّۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند

اور نظرِ تعمّق سے دیکھیے، تو یہ اعلان ضروری تھا کیونکہ جب اس سفر کی آخری منزل شہادت تھی تو خواہ ناقے کا رُخ کسی طرف ہوتا، دستِ کارفرما کا فرض تھا کہ اسی طرف پھیر دے ؎

منصور را کہ رخصتِ اظہار دادہ اند
غیر از قصاص و محنتِ زنداں نبودہ شرط

غرض کہ جب سرمد نے توبہ نہ کی تو علماء نے بلا تامّل فتویٰ قتل صادر کیا اور دوسرے دن قتلگاہ میں لے گئے۔ بموجب بیان مرٔۃ الخیال یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ ہجری میں ہوا کہ عالمگیر کی تخت نشینی کو تین سال سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا ؎

مو بمویم دوست شد ترسم کہ استبلائے عشق
یک انا الحق گوے دیگر بر سرِ دار آورد

شاید اسد اللہ نامی ایک مردِ درویش وحق آگاہ راوی ہیں کہ مجھے سرمد کی خدمت میں کمال خصوصیت حاصل تھی۔ جب شورش و ہنگامہ شروع ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک دن موقع پا کر عرض کیا کہ ''اگر اپنی وضع و حالت بدل دیں، تو بندگانِ الٰہی کی منّت و سماجت دیکھتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نہیں''۔ یہ سُن کر نظر اُٹھائی اور اپنا یہ شعر

پڑھ دیا ؎

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

جب سرمد کو شہادتگاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا، اور اس قدر ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے، جہاں کا عام پسند تماشا خونریزی ہے اور جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں۔ جب کوئی سر دادہ سربکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولھے کی سواری جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے ؎

بجرمِ عشق توام میکشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

مگر یہ عشقِ مجازی تھا کہ سرِ بام آنے کی خواہش کی گئی، ورنہ سرمد کو تو سر اٹھانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ جب جلاد تلوار چمکاتا ہوا آگے بڑھا، تو مسکرا کے نظر ملائی اور کہا "فدایت شوم، بیا بیا کہ تو بہر صورتے کہ می آئی، من ترا خوب می شناسم"۔ صاحبِ مرآۃ الخیال راوی ہے کہ اس جملے کے کہنے کے بعد یہ شعر پڑھا اور مردانہ وار تلوار کے نیچے سر رکھ کر جان دے دی ؎

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

صاحبِ مرآۃ الخیال کو عالمگیر کی خوشامد سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ سرمد کی نعش خون آلود پر اشک افشانی کرتا۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس سنگین دلی پر قانع نہ ہو کر چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ خونریزی بھی عالمگیر کے دفترِ مناقب و فضائل میں جگہ پائے، حال آنکہ اس دفتر میں تو پہلے ہی سے ہر صفحہ رنگین ہے، اس کو بھی عشق ہی کی شیوہ گری سمجھیے کہ یہاں کی قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلود ہوتے ہیں، وہ مجرم و خونی ہونے کی جگہ تحسین و ثواب کا صلہ مانگتے ہیں گویا میدانِ عشق بھی قربانگاہ بنا ہے کہ جس قدر خون بہائیے، عین ثواب ہے ؎

یہ عجب میں رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سرمدؔ کی جہاں قبر سمجھی جاتی ہے، یہ اُس کا مدفن نہیں، صرف مشہد ہے۔ لیکن والہ داغستانی نے تصریح کر دی ہے کہ "درجنبِ مسجد جامع گردن اُورا زدند و در ہمانجا دفن کردند"۔ یہ مقام موجودہ مقامِ مزار کے سوا اور کونسا ہو سکتا ہے؟ پھر لکھتے ہیں کہ "راقم الحروف بزیارتِ مزارِ وے مکرّر مشرف شدہ ام۔ در چہار فصل سبزہ از تربتش کم نمی شود۔ والحق فیضِ عجیبے در زیارتِ آن منصورِ ثانی است"۔ والہ داغستانی عہدِ محمد شاہی میں تھا اور اس کے تذکرے کا سالِ تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے۔ لیکن آج بھی مشہدِ سرمد زیارت گاہِ عوام و خواص ہے اور ہمیشہ فاتحہ کے ہاتھ اُس کے آگے رُو بآسماں رہتے ہیں ؂

برسرِ تربتِ من چون گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

خلیفہ ابراہیم، جن کے حالات اوپر گذر چکے ہیں، راوی ہیں کہ سرمدؔ نے زندگی میں کلمۂ طیبّہ لاالٰہ سے زیادہ نہیں پڑھا، لیکن جب شہادت پائی تو لوگوں نے سُنا کہ سرِ کُشتہ سے تین بار الّا اللہ کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے علاوہ والہ داغستانی لکھتے ہیں کہ ایک ثقہ جماعت سے سُنا گیا ہے کہ سرمدؔ کا سرِ مقتول کلمۂ طیبّہ پڑھتا رہا اور اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ دیر مصروفِ حمدِ الٰہی بھی رہا۔ موجودہ زمانے میں ایسی روایتوں پر لوگ بمشکل یقین لائینگے۔ اور سوانح نگار کا فرض ہے کہ خوش اعتقادی کی روایات اور تاریخ کو الگ الگ رکھے۔ لیکن ہمیں تو یہ بیان پڑھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوا کیوں کہ اگر خوش اعتقادی کے کان نہیں ہیں تو کیا حقیقت بینی کی آنکھوں سے بھی محروم ہونا چاہیے؟ ہم نے بہار میں شگفتہ و شاداب پھولوں اور خزاں میں افسردہ اور خشک شاخوں کو باتیں کرتے دیکھا ہے۔ پھر اگر ایک شہیدِ عشق کے سرِ مقتول کی لبیں ہلتی نظر آئیں، تو کیوں تعجب ہو؟ ممکن ہے کہ سرمدؔ کے بیجان سر سے آواز نہ نکلی ہو مگر اربابِ بصیرت نے اس کی زبانِ حال کو تو ضرور متکلم دیکھا ہوگا

اور ڈھائی سو برس سے زیادہ گذر گئے۔ ہمارے کانوں میں تواب تک مشہدِ سرمد سے صدا آرہی ہے کہ ؎

کس چہ داند قدر مرد نہای عشق

منّت این مرگ بر جانِ من است

عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا اور تین سال کے بعد سرمد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ایک قرن سے زیادہ عرصے تک حکومت کی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ع

خونے کہ عشق ریزد، ہرگز ہدر نباشد

یہ سرمد کے خون ہی کی نیرنگیاں تھیں کہ اس تمام مدت میں عالمگیر کو کبھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے، یہاں تک کہ پیغامِ اجل بھی آیا تو عالمِ غربت و پریشانی میں۔ مگر سوانح نویس کے قلم سے ایسے جملے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے لیے تو یہی بہتر ہے کہ ہو سکے تو عالمگیر کو بھی اس معاملے میں معذور سمجھیں۔ تاریخ قیاس و ظنون اور شخصی آراء کے پریشان مجموعوں کا نام ہے۔ آج چند میلوں کے فاصلے پر ایک حادثہ گزرتا ہے، تو اخباروں کے دو نامہ نگار متفق البیان نہیں ہوتے۔ کس کو معلوم ہے کہ اس وقت کی اصلی حالت کیا تھی اور عالمگیر کے گرد و پیش کن حالات و اسباب کا ہجوم تھا! پھر یہ بھی ہے کہ خون رفتگانِ عشق جب اپنے قاتلوں سے گلہ مندِ جفا نہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ اُن کی شکایت سے قلم آلودہ ہوں۔ جب سرمد نے جلّاد سے کہا "تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب میشناسم" تو اسے عالمگیر اور عالمگیری علماء سے کیا شکایت ہوگی؟ بات یہ ہے کہ دیارِ محبت میں انتقام و دعوے کی شنوائی نہیں، اور عشق کے مذہب میں کینہ و عداوت سے بڑھ کر کوئی شے حرام نہیں۔ یہاں سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ قاتل تیغ لے کر آئے، تو سر جھکا دیجیے اور ہو سکے تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجیے۔ ؎

شدست سینہ ظہوری! پُر از محبت یار

برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

سرمد کے کلام کا ایک صحیح اور قلمی نسخہ میرے کتبخانے میں موجود ہے۔ مگر اس وقت پیشِ نظر

نہیں۔ چند سطروں کا ارادہ تھا مگر کئی صفحے ہو گئے۔ اور عشق کی حکایت کب ختم ہونے والی ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ روح سرمد پر دستِ فاتحہ اُٹھا کر خاموش ہو جاؤں۔ آیندہ کبھی موقعہ ملا، تو سرمد کا کلام پیش کرونگا۔ افسوس ہے کہ یہ داستان مختصر نہ ہوسکی مگر شہیدانِ محبت کی یاد میں جتنی دیر افسردہ رہ سکیے بہتر ہے ؎

لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم
چناں کہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

ابوالکلام آزاد دہلوی

رُبُوبّیت

قرآن کی سورۃ الفاتحہ میں (خداوند تعالیٰ کی) "حمد" کے بعد بالترتیب چار صفتیں بیان کی گئی ہیں:
"ربّ العالمین"، "الرحمن"، "الرحیم"، "مالک یوم الدّین"۔ چونکہ "الرحمٰن" اور "الرحیم" کا تعلق ایک ہی صفت کے دو مختلف پہلوؤں سے ہے، اس لیے دوسرے لفظوں میں انھیں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ربوبیت، رحمت، عدالت تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے:
"الٰہ" کی طرح "رب" بھی سامی زبانوں کا ایک کثیرالاستعمال مادّہ ہے۔ عبرانی، سریانی، اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے، اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیے۔ پھر چونکہ معلّم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں، اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "ربّی" اور "رباہ" پرورش کنندہ، معلّم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ "رابو" بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔
بہرحال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں، لیکن پالنے کو اس کے وسیع

اور کامل معنوں میں لینا چاہیے۔ اسی لیے بعض ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے: "ہو انشاء الشیء حالاً فحالاً الی حدّ التمام"۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اُس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے، تو یہ اس کا کرم ہوگا، جُود ہوگا، احسان ہوگا، لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سرو سامان ہوتا رہے، نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو، کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا، ربوبیت نہیں ہو سکتا۔

ربوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں، جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے، سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت و شفقت حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے، جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں، بے شمار ہیں۔ ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ اور زندگی کا سرو سامان ملتا رہے۔ حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خد و خال پیدا کر دیے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیت ہی ہے، جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچے کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سرو سامان مہیا

کرتی رہتی ہے۔

جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا، تو اُسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی، تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی، تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی، جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی وحفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا، وہ صورت حال ہے جس سے رُبوبیت کے مفہوم کا تصوّر کیا جاسکتا ہے۔

مجازی رُبوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ اور رُبوبیتِ الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصوّر کرو۔ اس کے "رَبّ العالمین" ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ طرح اس کی خالقیّت نے کائنات ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے، اسی طرح اس کی رُبوبیّت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب وغریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے، ہر ضرورت کا لحاظ ہے، ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔ چیونٹی اپنے بل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اُڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضانِ رُبوبیّت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے، تو مخلوقات کی بیشمار قسمیں ایسی ملینگی جو اتنی حقیر اور بےمقدار ہیں کہ غیر مسلح آنکھ سے ہم اُنھیں دیکھ بھی نہیں سکتے: تاہم

ربوبیتِ الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لیے سامانِ پرورش مہیّا کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیّا کی ہے اور پھر یہ جو کچھ بھی ہے انسان کے وجود سے باہر ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے، تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ رُبوبیّتِ الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے:

> ان لوگوں کے لیے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمھارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟
>
> (۵۱ھ : ۲۰ - ۲۱)

نِظامِ رُبوبیّت:

لیکن سامانِ زندگی کی بخشایش میں اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے اُسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دنیا میں ایسے عناصر، عناصر کی ایسی ترکیب اور اشیاء کی ایسی بناوٹ موجود ہے، جو زندگی اور نشوونما کے لیے سُودمند ہے، تو محض اس کی موجودگی ربوبیّت سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ ایسا ہونا قدرتِ الٰہی کی رحمت ہے، بخشش ہے، احسان ہے، مگر وہ بات نہیں ہے جسے رُبوبیّت کہتے ہیں۔ ربوبیّت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں سُودمند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ اُن کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں، بلکہ جو کچھ بخشتی ہے، ایک مقررّہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جس جس انتظام کی ضرورت تھی اور جس جس وقت اور جیسی جیسی مقدار کی ضرورت تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح انھیں وقتوں میں اور اسی مقدار میں اسے مل رہی ہے اور اس

نظم و انضباط سے تمام کارخانۂ حیات چل رہا ہے۔

پانی کی بخشش و تقسیم کا نظام زندگی کے لیے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں۔ لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا، تو یہ زندگی کے لیے کافی نہ تھا کیونکہ زندگی کے لیے صرف یہی ضروری نہیں کہ پانی موجود ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص انتظام، ایک خاص ترتیب اور ایک خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس، یہ جو دنیا میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازے کے مطابق بانٹتی رہتی ہے، تو یہی ربوبیت ہے اور اسی سے ربوبیت کے تمام اعمال کا تصوّر کرنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا۔ لیکن اس کی رُبوبیت ہے، جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی۔ ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے:

> اور (دیکھو!) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ پانی برسایا، پھر اسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح) اُسے واپس لے جائیں۔ پھر (دیکھو) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیے جس میں بے شمار پھل لگتے ہیں اور انھیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔ (۲۳: ۱۸-۱۹)

تقدیرِ اشیاء یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے، یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرتِ کائنات جو کچھ بخشتی ہے، ایک خاص اندازے کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص

قانون کے ماتحت ٹھیرایا ہوا ہے :-

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں۔
(لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ) جو کچھ نازل کرتے ہیں، ایک
مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں، ایک اندازے کے ساتھ پیدا
کی ہیں۔ (۵۴ : ۴۹)

یہ کیا بات ہے کہ دنیا میں صرف یہی نہیں کہ پانی موجود ہے، بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے؟ یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انھیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسا دیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک مقدار بہنے لگے اور اندرونی حصّوں تک ایک خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں، پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دُور دُور تک دوڑ جاتی ہیں، اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہوتا، مگر اس انتظام اور ترتیب کے ساتھ نہ ہوتا؟

قرآن کہتا ہے: اس لیے کہ کائنات ہستی میں رُبُوبیّتِ الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیّت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا، مگر یہ رُبُوبیّت ہے،

جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں:

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں، پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انھیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینھ نکل رہا ہے۔ پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی، مل چکتی ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔ (۳۰: ۴۸)

عناصرِ حیات

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زندگی کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، انھیں کی بخشایش سب سے زیادہ اور عام ہے اور جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں اور گوشوں کے لیے تھی، انھیں میں اختصاص اور مقامیت پائی جاتی ہے۔ ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے، مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔ پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ کوئی جگہ، کوئی گوشہ، کوئی وقت نہیں جو اس سے خالی ہو۔ فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سانس لو، زندگی کا یہ سب سے زیادہ ضروری جوہر تمھارے لیے خود بخود مہیا ہو جائے گا۔ ہوا کے بعد دوسرے درجے پر پانی ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱: ۳۰) اس لیے اس کی بخشایش کی فراوانی و عمومیت ہوا سے کم مگر اور ہر چیز سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے آب شیریں کی سوتیں بہ رہی ہیں۔ زمین کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں ہیں۔ پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے۔ وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے، اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے، پھر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ پانی کے بعد غذا کی ضرورت

تھی ۔ لہٰذا ہوا اور پانی سے کم، مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دسترخوان کرم بھی خشکی اور تری میں بچھا ہوا ہے اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

نظامِ پرورش

پھر سامانِ پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو، جو اپنے ہر گوشۂ عمل میں پروردگی کی گود اور بخشش حیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لیے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لیے ہے کہ روشنی کے لیے چراغ کا اور گرمی کے لیے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں سے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لیے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں اور کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بچھا دیں کبھی ابر کو پانی بنا کر بارش بنا دیں۔ زمین اس لیے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لیے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لیے اپنے سینے میں پروردگی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اس کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت استعداد ڈھونڈھ رہی ہے اور ہر تاثیر اثر پذیری کے انتظار میں ہے۔ جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں، فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں، عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے۔

> اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے، سب کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ بلا شبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں، اس بات میں (معرفتِ حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں

ہیں: (۳۵ : ۱۳)

نظامِ رُبوبیّت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب، مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظامِ رُبوبیّت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے، وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل وقاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا بظاہر گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے، لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالو گے، تو صاف نظر آجائیگا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پالے پوسے جارہے ہیں۔ انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمھاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں! لیکن اگر ان کی نشوونما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لوگے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کردیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لیے پیدائش ہے، اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامان پرورش مہیا ہو جاتا ہے، پھر طفولیت کا دور ہے اور اس دور کی ضروریات ہیں۔ انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے، درخت کے مولودِ نباتی کے لیے بھی طفولیت ہے۔ اور تمھاری چشمِ ظاہر بین کے لیے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو، لیکن پتھر کی چٹان کا تودہ بھی اپنی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ پھر طفولیت رشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، اس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے سامان پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سنِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب سن کمال تک پہنچ گیا تو از سرِ نو ضعف و انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اس ضعف و انحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لیے ایک ہی طرح ہے۔ کسی دائرے میں اسے مرجانا کہتے ہیں، کسی میں مرجھا جانا اور کسی میں پامال ہو جانا۔ الفاظ متعدد ہوگئے، مگر

حقیقت میں تعدد نہیں ہوا۔

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمھیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے، پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ وہ، جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے۔

(۳۰ : ۵۴)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر زمین میں اس کے چشمے رواں ہو گئے۔ پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں، پھر ان کی نشوونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں۔ پھر (ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی، پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہو گئیں۔ بلاشبہہ دانشمندوں کے لیے اس صورت میں بڑی ہی عبرت ہے!

(۳۹ : ۲۱)

جہاں تک غذا کا تعلق ہے حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں۔ اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو! نظام ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لیے کیسا عجیب سروسامان مہیا کر دیا ہے! دودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے، جوں ہی وہ پیدا ہوتا ہے، اس کی غذا اپنی خاصیتوں، مناسبتوں اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے، اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو حالت طفولیت میں اس کے لیے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے۔ ماں بچے کو جوش محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں

اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو! اس غذا کی نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے!! ابتدا میں بچّے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیے۔ چنانچہ نہ صرف انسان میں، بلکہ تمام حیوانات میں، ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے، دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے اور مائیت کے مقابلے میں دُہنیت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بچے کا عہدِ رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ جوں ہی اس کا وقت آتا ہے، ماں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ یہ گویا رُبُوبیّت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، ہر طرح کی غذائیں استعمال کر سکتا ہے:

اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدّت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔ (۴۶ : ۱۵)

پھر ربوبیتِ الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچّے کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے اور کس طرح اس جذبے کو طبیعتِ بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پُر جوش اور سب سے زیادہ ناقابلِ تسخیر بنا دیا گیا ہے! دنیا کی کونسی قوت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کر سکتی ہے، جسے ماں کی ماتا کہتے ہیں؟ جس بچّے کی پیدائش اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی:

اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔ (۴۶ : ۱۵)

اُسی کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے جب تک بچہ سنِ بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا ہے، وہ اپنے لیے نہیں، بلکہ بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں، جو اس پر طاری نہ ہوتی

ہو۔ اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں، جس سے اسے گریز ہو۔
حبِّ ذات جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے اور جس کے انفعال کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی، وہ بھی اس جذبۂ خود فراموشی کے مقابلے میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی، فطرتِ مادری کا ایسا معمولی واقعہ ہے، جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔
لیکن پھر دیکھو! کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبّتِ مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب حیوانات میں تو بالکل ہی بجھ جاتا ہے اور انسان میں بھی اس کی گرم جوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہ انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ بچّے کے پیدا ہوتے ہی محبّت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آ جائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بخود غائب ہو جائے؟ اس لیے کہ یہ نظامِ ربوبیّت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچّے کی پرورش ہو۔ اس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبۂ محبت میں رکھ دیا۔ جب بچّے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ اب اس کا باقی رہنا ماں کے لیے بوجھ اور بچے کے لیے رکاوٹ ہوتا۔ بچّے کی احتیاج کا سب سے زیادہ نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی۔ اس لیے ماں کی محبّت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا۔ پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا، احتیاج کم ہوتی گئی۔ اس لیے محبت کی گرم جوشیاں بھی گھٹتی گئیں۔ فطرت نے محبّتِ مادری کا دامن بچے کی احتیاجِ پرورش سے باندھ دیا تھا۔ جب احتیاج زیادہ تھی تو محبّت کی سرگرمی بھی زیادہ تھی۔ جب احتیاج کم ہو گئی تو محبّت بھی تغافل کرنے لگی۔
جن حیوانات کے بچے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی جسمانی ساخت اور طبیعت

دودھ والے حیوانات سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اول دن ہی سے معمولی غذائیں کھا سکتے ہیں، بشرطیکہ کھلانے کے لیے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچہ انڈے سے نکلتے ہی غذا ڈھونڈنے لگتا ہے اور ماں چن چن کر اس کے سامنے ڈالتی اور مُنہ میں لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی۔ اپنے اندر نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچّہ غذا کے لیے مُنہ کھولتا ہے، تو اس کے اندر اُتار دیتی ہے۔

رُبوبیّتِ معنوی

پھر اس سے بھی عجیب تر نظامِ ربوبیّت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سرو سامان کیا جاتا، لیکن وہ کچھ مفید نہیں ہو سکتا تھا، اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی اور اس کے ظاہری و باطنی قویٰ اس کا ساتھ نہ دیتے۔ بس یہ رُبوبیّت ہی کا فیضان ہے کہ ہم دیکھتے ہیں؛ ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی ہر قوت اس کے سامانِ پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اسے زندہ رہنے اور نشو و نما پانے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مخلوق اپنے جسم و قویٰ کی ایسی نوعیت رکھتی ہو جو اس کے حالاتِ پرورش کے مقتضیات کے خلاف ہو۔ اس سلسلے میں جو حقائق مشاہدہ و تفکّر سے نمایاں ہوتے ہیں ان میں دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اس لیے جا بجا قرآن حکیم نے ان پر توجہ دلائی ہے۔ ایک کو وہ تقدیر سے تعبیر کرتا ہے، دوسری کو ہدایت سے۔

تقدیر

تقدیر کے معنی اندازہ کر دینے کے ہیں، یعنی کسی چیز کے لیے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے، خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے، جس سے وہ باہر نہیں

جا سکتا۔ اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشوونما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے:

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں، پھر ہر چیز کے لیے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھہرایا!

(۲۵ : ۲)

یہ کیا چیز ہے کہ ہر گرد و پیش میں اور اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا قانونِ خلقت ہے، جو کبھی متغیر نہیں ہو سکتا؟ یہ کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسا اس کا گرد و پیش ہے اور ہر گرد و پیش ویسا ہی ہوتا، جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ یہ اس حکیم و مدبر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی خلقت و زندگی کے لیے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اس کا یہ قانونِ تقدیر صرف حیوانات و نباتات ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز کے لیے ہے۔ ستاروں کا یہ پورا نظامِ گردش بھی اسی تقدیر کی حد بندیوں پر قائم ہے:

اور دیکھو سورج کے لیے جو قرارگاہ ٹھہرا دی گئی ہے وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز و علیم خدا کی اس کے لیے تقدیر ہے۔

(۳۶ : ۳۸)

مخلوقات اور اس کے گرد و پیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہم دگر مناسبت پیدا کر دی ہے۔ اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لیے پرورش اور نشوونما کا سامان ہوتا ہے، پرند کا جسم اڑنے والا ہے مچھلی کا تیرنے والا، چارپایوں کا چلنے والا، حشرات کا رینگنے والا اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کا گرد و پیش ویسے ہی جسم کے لیے موزوں ہے جیسا اسے ملا ہے اور اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کی جسمانی ساخت ویسا ہی گرد و پیش چاہتی ہے جیسا گرد و پیش اسے حاصل ہے۔ دریا میں پرند پیدا نہیں ہوتا،

اس لیے کہ یہ گرد و پیش اس کے لیے مفید پرورش نہیں۔ خشکی میں مچھلیاں پیدا نہیں ہو سکتیں، کیونکہ خشکی ان کے لیے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف ایک خاص گرد و پیش کی مخلوق دوسرے قسم کے گرد و پیش میں چلی جاتی ہے، تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی، یا رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گرد و پیش میں ہونی چاہیے۔

پھر ان میں سے ہر نوع کے لیے مقامی مؤثرات کے مختلف گرد و پیش ہیں اور ہر گرد و پیش کا یہی حال ہے۔ سرد آب و ہوا کی پیداوار، سرد آب و ہوا ہی کے لیے ہے، گرم کی گرم کے لیے۔ قطبِ شمالی کے قرب و جوار کا ریچھ خطِ استوا کے قرب میں نظر نہیں آسکتا اور منطقۂ حارّہ کے جانور منطقۂ بارده میں معدوم ہیں۔

ہدایت ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے، رہنمائی کرنے کے ہیں اور اس کے مختلف مراتب اور اقسام ہیں۔ تفصیل آگے آئیگی۔ یہاں صرف اس مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی راہیں کھولتا، انھیں زندگی کی راہ پر لگاتا، اور ضروریاتِ زندگی کی طلب و حصول میں رہنمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے اور اگر ہدایتِ ربوبیت کی دستگیری نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں۔

لیکن ربوبیتِ الٰہی کی یہ ہدایت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، یہ وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ وہ کہتا ہے یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے، جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے، پھر حواس و ادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراتب میں سے وجدان اور ادراک کی ہدایت کے مراتب ہیں۔

ہدایتِ وجدان وجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، ہر مخلوق کی طبیعت

میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے اور وہ باہر کی رہنمائی و تعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو، یا حیوان کا، جونہی شکم مادر سے باہر آتا ہے، خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منھ میں لیتا ہے تو جانتا ہے کہ اسے زور زور سے چوسنا چاہیے۔ بلی کے بچوں کو ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں، لیکن ماں جوشِ محبت میں انھیں چاٹ رہی ہے، وہ اس کے سینے پر منھ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے مؤثرات نے چھوا تک نہیں، کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منھ میں لے لینا چاہیے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے؟ وہ کون سا فرشتہ ہے جو اس وقت اس کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کر لے؟ یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے اور یہی وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے کہ حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو، ہر مخلوق کو اس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

تمھارے گھر میں پلی ہوئی بلی ضرور ہوگی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے۔ اس حالت کا اسے کوئی پچھلا تجربہ حاصل نہیں۔ تاہم اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ تیاری و حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہییں۔ جونہی وضعِ حمل کا وقت آتا ہے، خود بخود اس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بضطرابانہ بلی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علیحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچہ دیتی ہے۔ پھر یکایک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ غور کرو! یہ کون سی قوت ہے جو بلی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ محفوظ جگہ تلاش کرے، کیونکہ عنقریب ایسی جگہ کی اسے ضرورت ہوگی؟ یہ کون سا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلا بچوں کا دشمن اور ان کی بو سونگھتا پھرتا ہے اس لیے

جگہ بدلتے رہنا چاہیے؟ بلاشبہ یہ ربوبیتِ الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور رجحان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

ہدایتِ حواس

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے اور وہ اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں، جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاہم فطرت نے انھیں احساس و ادراک کی وہ تمام قوتیں دے دی ہیں، جن کی زندگی و معیشت کے لیے ضرورت تھی اور ان کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے، بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے، جتنی اور جیسی استعداد اس کے احوال و ظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوتِ شامّہ نہایت دُور رس ہوتی ہے، اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اڑتے ہوئے اپنا شکار دیکھ نہ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانونِ مطابقت کے مؤثرات سے بتدریج ظہور میں آئی، اس لیے کہ خواہ کوئی صورت ہو، بہرحال فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے اور نشو و ارتقاء کا قانون بھی فطرت ہی کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔

چنانچہ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جس کو قرآن نے ربوبیتِ الٰہی کی "وحی" سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی مخفی ایما اور اشارے کے ہیں۔ یہ گویا فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی ہے جو ہر مخلوق پر اس کی راہِ عمل کھول دیتی ہے:

اور دیکھو! تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں
یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں
میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں، اپنے لیے چھتے بنائے۔

(۱۶ : ۶۸)

اور یہی وہ رُبوبیّتِ الٰہی کی ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ (علیہ السّلام) کی زبانی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرعون نے جب پوچھا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى؟ تمھارا پروردگار کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ نے کہا:

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی،
پھر اس پر (زندگی و معیشت کی) راہ کھول دی۔

(۲۰ : ۵۰)

اور پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دوسری جگہ "راہِ عمل آسان کر دینے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:

اس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا؟ نطفے سے پیدا کیا۔ پھر اس
(کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں) کے لیے ایک اندازہ ٹھیرا دیا پھر
اس پر (زندگی و عمل کی) راہ آسان کر دی۔

(۸۰ : ۱۸-۲۰)

یہی "راہِ عمل آسان کر دینا" وجدان و ادراک کی ہدایت ہے جو تقدیر کے بعد ہے، کیونکہ اگر فطرت کی یہ رہنمائی نہ ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکتے۔

آگے چل کر تمھیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے تکوینِ وجود کے جو چار مرتبے بیان کیے ہیں، ان میں سے تیسرا اور چوتھا مرتبہ یہی تقدیر اور ہدایت کا مرتبہ ہے۔ تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت:

وہ پروردگارِ عالم جس نے پیدا کیا پھر اسے ٹھیک درست

کر دیا۔ اور جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھیرا دیا پھر اس پر
راہ (عمل) کھول دی۔ (۸۷ : ۲ - ۳)

براہینِ قرآنیہ کا مبدءِ استدلال

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی ہستی اور اس کی توحید و صفات پر جا بجا نظام راو بیت سے استدلال کیا ہے اور یہ استدلال اس کے مہمات دلائل میں سے ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کی تشریح کی جائے، مناسب ہوگا کہ قرآن کے طریقِ استدلال کی بعض مبادیات واضح کر دی جائیں کیونکہ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، مطالب قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہو گیا ہے اور ضرورت ہے کہ از سرِ نو حقیقتِ گم گشتہ کا سراغ لگایا جائے۔

دعوتِ تعقّل

قرآن کے طریقِ استدلال کا اوّلین مبدءِ تعقّل و تفکّر کی دعوت ہے، یعنی وہ جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ بھی محسوس کر سکتا ہے، اس میں تدبّر و تفکّر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصّہ نہیں، جو تفکّر و تعقّل کی دعوت سے خالی ہو:

اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں بھی (معرفتِ حق کی) نشانیاں ہیں اور خود تمھارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

(۵۱ : ۲۰ - ۲۱)

وہ کہتا ہے انسان کو عقل و بصیرت دی گئی ہے، اس لیے وہ اس قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لیے جواب دہ ہے:

یقیناً (انسان کا) سننا، دیکھنا، سوچنا، سب اپنی اپنی جگہ جوابدہی رکھتے ہیں!

(۱۷ : ۳۶)

وہ کہتا ہے: زمین کی ہر چیز میں، آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیّر میں، فکرِ انسانی

کے لیے معرفتِ حقیقت کی نشانیاں ہیں، بشرطیکہ وہ غفلت و اعراض میں مبتلا نہ ہو جائے:

اور آسمان و زمین میں (معرفتِ حق کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں، لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر!) لوگ ان پر سے گذر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں!

(۱۲ : ۱۰۵)

تخلیق بالحق

اچھا! اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے اور کائناتِ خلقت میں تفکر کرے، تو اس پر حقیقت شناسی کا کونسا دروازہ کھلیگا؟ وہ کہتا ہے: سب سے پہلی حقیقت جو اس کے سامنے نمودار ہوگی وہ تخلیق بالحق کا عالمگیر اور بنیادی قانون ہے۔ یعنی وہ دیکھیگا کہ کائناتِ خلقت اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی شے نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو، یعنی بغیر کسی معیّن اور ٹھیرائے ہوئے مقصد و نظم کے وجود میں آ گیا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس دقّت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی:

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہہ اس بات میں ارباب ایمان کے لیے (معرفتِ حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے!

(۲۹ : ۴۴)

"آل عمران" کی مشہور آیت میں ان ارباب دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کرتے ہیں، صدائے حال یہ بتائی ہے:

اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو!

(۳ : ۱۹۱)

دوسری جگہ "تخلیق بالباطل" کو تلعب سے تعبیر کیا ہے۔ "تلعب" یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے کرنا:

> ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، محض کھیل اور تماشہ کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے، ہم نے انھیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ، مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔
>
> (۴۴ : ۳۸ - ۳۹)

پھر جا بجا اس "تخلیق بالحق" کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر "تخلیق بالحق" کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لیے ہے اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے، اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع اور راحت ہو:

> اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹتا آتا ہے۔ اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے۔ سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لیے گردش کر رہے ہیں۔ سنو! وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔
>
> (۳۹ : ۵)

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام سماویہ کے افادہ و فیضان پر توجہ دلائی ہے اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے:

> وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشاں اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لیے منزلیں ٹھیرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (اوقات کا) حساب معلوم کر لو۔ بلاشبہ اللہ

نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ وہ
ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں، (علم و معرفت کی) نشانیاں
الگ الگ کر کے واضح کر دیتا ہے۔ (۱۰ - ۵)

ایک اور موقع پر فطرت کے جمال و زیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے، یعنی فطرتِ کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اس میں حسن وجمال اور خوبی و کمال ہو:

اس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا
کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ
بنائیں۔ (۶۴ : ۳)

اسی طرح وہ قانون مجازات پر (یعنی جزاء و سزا کے قانون پر) بھی اسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے۔ اور تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص اور نتائج نہ ہوں اور وہ قطعی اور اٹل نہ ہوں جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے، کیا انسان کے اعمال میں اس امتیاز سے غافل ہو جائیگا؟

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں، ہم انھیں ان لوگوں
جیسا کر دینگے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں، یعنی دونوں
برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی۔ (اگر ان لوگوں
کے فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو) کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے!
اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و
مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق
بدلا پالے۔ اور ایسا نہیں ہو گا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔
(۴۵ : ۲۱ - ۲۲)

معاد، یعنی مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اس سے جا بجا استشہاد کیا ہے۔ کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے۔ پس، ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو۔ یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائناتِ ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اس لیے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے:

> کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے۔ ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت ٹھیرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یکقلم منکر ہیں۔ (۳۰ : ۸)

مبدءِ استدلال

غرض کہ قرآن کا مبدءِ استدلال یہ ہے کہ:

۱۔ اس کے نزول کے وقت دینداری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصوّرات موجود تھے، وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے، بلکہ ان کی تمامتر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آکر ٹھیر گئی تھی، لیکن اس نے خدا پرستی کے لیے عقلی تصوّر پیدا کیا۔

۲۔ اس کی دعوت کی تمامتر بنیاد تعقّل و تفکّر پر ہے اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائناتِ خلقت کے مطالعے و تفکّر کی دعوت دیتا ہے۔

۳۔ وہ کہتا ہے: کائناتِ خلقت کے مطالعہ و تفکّر سے انسان پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھیرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو اور کسی بالاتر قانونِ خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلے میں بندھی ہوئی ہے۔

۴۔ وہ کہتا ہے: جب انسان ان مقاصد و مصالح پر غور کریگا، تو عرفانِ حقیقت کی راہ خود بخود اس پر کھل جائیگی اور وہ جہل و کوری کی گمراہیوں سے نجات پا جائیگا۔

برہانِ رُبوبیّت

چنانچہ اس سلسلے میں اس نے مظاہرِ کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے، ان میں سب سے زیادہ عام استدلال "ربوبیت" کا استدلال ہے اور اسی لیے ہم اُسے بُرہانِ رُبوبیّت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظامِ رُبوبیّت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگارِ عالم ہستی موجود ہے اور وہ ان تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظامِ ربوبیّت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

وہ کہتا ہے: کیا انسان کا وجدان یہ باور کر سکتا ہے کہ نظامِ ربوبیّت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک اُبھری ہوئی کارسازی موجود ہو، مگر کوئی پروردگار، کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ پھر کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت، بیجان مادّہ اور بےحس الکٹرون (Electrone) کے خواص ہیں، جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے اور عقل اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں؟

پروردگاری موجود ہے، مگر کوئی پروردگار موجود نہیں! کارسازی موجود ہے، مگر کوئی کارساز موجود نہیں! رحمت موجود ہے، مگر کوئی رحیم نہیں! حکمت موجود ہے، مگر کوئی حکیم موجود نہیں! سب کچھ موجود ہے، مگر کوئی موجود نہیں! عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوّم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش

بغیر کسی نقّاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجد کے! نہیں، انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آئی ہے، جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک اور انکار کی اس میں سمائی نہیں۔

قرآن کہتا ہے: یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظامِ ربوبیت کا مطالعہ کرے اور ایک "ربّ العالمین" ہستی کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اُٹھے۔ وہ کہتا ہے: ایک انسان غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کر دے سکتا ہے، لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر سکتا ہے، لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتیار نہیں اُٹھا سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اس کے دل کے ایک ایک ریشے میں کون سا اعتقاد سمایا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی ہے اور یہ سب کچھ اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں؟

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدّمات اور ذہنی مسلّمات کی شکلیں ترتیب دے، پھر اس پر بحث و تقریر کر کے مخاطب کو ردّ و تسلیم پر مجبور کرے۔ اس کا تمامتر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلیلیں پیش کی جائیں۔ لیکن یہ دلیل ایسی ہونی چاہیے جو محض ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کر دے، بلکہ ایسی ہونی چاہیے جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثباتِ مدّعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہو گی خود اس کا وجدان ہی اسے مدّعا تک پہنچا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجّت لاتا ہے:

بلکہ انسان کا وجود خود اس کے خلاف (یعنی اس کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے، اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔ (۷۵ : ۱۴-۱۵)

اور اسی لیے وہ جا بجا فطرتِ انسانی کو مخاطب کرتا ہے، اور اس کی گہرائیوں سے جواب طلب کرتا ہے:

اے پیغمبر! ان سے کہو: وہ کون ہے جو آسمان (میں پھیلے ہوئے کارخانۂ حیات) سے اور زمین (کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامانِ رزق) سے تمھیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضے میں تمھارا سننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بےجان سے جاندار کو، اور جاندار سے بےجان کو نکالتا ہے، اور پھر وہ کون سی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر!) یقیناً وہ (بے اختیار) بول اٹھینگے: اللہ ہے، (اس کے سوا کون ہو سکتا ہے؟) اچھا تم ان سے کہو: جب تمھیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر یہ کیوں ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بیشک یہ اللہ ہی ہے جو تمھارا پروردگار برحق ہے۔ اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ (افسوس تمھاری سمجھ پر تم حقیقت سے منھ پھرائے) کہاں جا رہے ہو؟ (۱۰ : ۳۱-۳۲)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور جس نے آسمانوں سے تمھارے لیے پانی برسایا، پھر اس آب پاشی سے خوشنما باغ اگا دیے، حالانکہ تمھارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے۔ کیا ان کاموں کا کرنے والا اللہ کے

ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ فسوس ان لوگوں کی سمجھ پر! حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے۔

اچھا بتاؤ! اور کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا، اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں، اس (کی درستگی) کے لیے پہاڑ بلند کر دئے، دو دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں (یعنی دریا اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس! کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔!

اچھا بتلاؤ! وہ کون ہے جو بیقرار دلوں کی پکار سنتا ہے، جب وہ (ہر طرف سے مایوس ہو کر) اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا درد دکھ ٹال دیتا ہے، اور وہ کہ اُس نے تمھیں زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمھاری غفلت پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

(اچھا بتاؤ!) وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا ہے؟ وہ کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو یہ لوگ اس کی معبودیت میں ٹھیرا رہے ہیں۔ اچھا بتاؤ! وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے اور پھر اسے دہراتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانہاے رزق سے تمھیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ

کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (اے پیغمبر!) ان سے
کہو اگر تم (اپنے رویے میں) سچے ہو (اور انسانی عقل و بصیرت
کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے)
تو اپنی دلیل پیش کرو۔ (۲۷ : ۶۰ - ۶۴)

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے، کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ فطرتِ انسانی کا عالمگیر اور مسلمہ اذعان ہے۔ ہمارے متکلموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی، اس لیے قرآن کا اسلوبِ استدلال ان پر واضح نہ ہو سکا اور وہ دور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔

بہرحال قرآن کے وہ بے شمار مقامات جن میں کائناتِ ہستی کے سر و سامانِ پرورش اور نظامِ ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں۔

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اس کے استعمال
میں آتی رہتی ہے) ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اس کی
سطح شق کر دیتے ہیں، پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی
چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں،
کھجور کے خوشے، سبزی، ترکاری، زیتون کا تیل، درختوں کے
جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح کا چارہ (اور یہ سب کچھ کس
کے لیے؟) تمہارے فائدے کے لیے اور تمہارے جانوروں کے
لیے! (۸۰ : ۲۴ - ۳۲)

ان آیات میں "فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ" کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے، لیکن دلائلِ حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ایک انسان تمام دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لے، لیکن بہرحال اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ جو غذا اس کے سامنے دھری ہے اسی پر نظر ڈالے۔

یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے۔ اچھا! گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آسکتا تھا اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایک ایسا نظامِ ربوبیّت موجود ہے، تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ربوبیّت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو۔

سورۂ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایے میں نمودار ہوا ہے:

> اور (دیکھو! یہ) چارپایے (جنھیں تم پالتے ہو) ان میں تمھارے لیے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے۔ (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔
>
> بلاشبہہ اس بات میں اربابِ عقل کے لیے (ربوبیتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے! اور پھر دیکھو! تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کر دی جاتی ہیں، اپنے لیے گھر بنائے، پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے پروردگار کے ٹھیرائے ہوئے طور طریقوں پر کامل فرماں برداری کے ساتھ گامزن ہو (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے جسم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے، جس میں انسان کے لیے شفا ہے۔ بلاشبہہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (ربوبیّتِ الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے!
>
> (۱۶: ۶۶ - ۶۹)

جس طرح اُس نے جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے، یعنی دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے، اس لیے ضروری ہے کہ خالق بھی ہو، اسی طرح وہ ربوبیت سے بھی استدلال کرتا ہے، یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو، اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے عیب ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ پس، ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہوسکتا جو خود پروردہ اور محتاج پروردگاری ہو، قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں، جیسا کہ سورۂ واقعہ کی مندرجۂ ذیل آیت میں ہے، وہ اسی استدلال پر مبنی ہیں:

> اچھا! تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کشت کاری کرتے ہو، اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُسے چُورا چُورا کردیں اور تم صرف یہ کہنے کے لیے رہ جاؤ کہ "افسوس! ہمیں تو اس نقصان کا تاوان بھی دینا پڑےگا۔ بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں ہی سے محروم ہوگئے"!
>
> اچھا! تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمھارے پینے میں آتا ہے، اسے کون برساتا ہے؟ تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کردیں۔ پھر کیا اس نعمت کے لیے ضروری نہیں کہ تم شکرگزار ہو؟ اچھا تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو تو اس کے لیے لکڑی تم نے پیدا کی ہے یا ہم پیدا کررہے ہیں؟ ہم نے اسے یادگار اور مسافروں کے لیے فائدہ بخش بنایا۔
>
> (۵۶: ۶۳-۷۳)

نظامِ رُبوبیّت سے توحید پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیّت سے توحیدِ الٰہی پر استدلال کرتا ہے۔ جو ربّ العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیّت کا اعتراف دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے، اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے؟

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، اس پروردگار کی جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، اور اس لیے پیدا کیا تاکہ تم برائیوں سے بچو۔ وہ پروردگارِ عالم جس نے تمھارے لیے زمین فرش کی طرح بچھا دی اور آسمان چھت کی طرح بنا دیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کر دیے، تاکہ تمھارے لیے رزق کا سامان ہو۔ پس (جب خالقیت اسی کی خالقیت ہے اور ربوبیت اسی کی ربوبیّت) تو ایسا نہ کرو کہ کسی دوسری ذات کو اس کا ہم پلّہ ٹھیراؤ، اور تم اس حقیقت سے بیخبر نہیں ہو! (۲ : ۲۱ - ۲۲)

یا مثلاً سورۂ فاطر میں ہے:

اے افرادِ نسلِ انسانی! اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمھیں فیضیاب کیا ہے، ان پر غور کرو! کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمھیں زمین اور آسمان کی بخشایشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں، کوئی معبود نہیں ہے مگر اسی کی ایک ذات! پھر تم (اس سے روگردانی کرکے) کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہو۔

(۳۵ : ۳)

نظامِ رُبوبیّت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیّت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔

جس رب العالمین نے تمہاری پرورش کے لیے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے، کیا ممکن ہے کہ اس نے تمہاری روحانی فلاح وسعادت کے لیے کوئی قانون کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمہارے جسم کی ضرورتیں ہیں، اسی طرح تمہاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ جسم کی نشوونما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو، لیکن روح کی نشوونما کے لیے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔

اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرّہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھتی ہے تو کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لیے ایک قطرۂ فیض بھی نہ رکھے؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے، تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرّے کو مالامال کر دیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ جب عالمِ انسانیت ہدایت وسعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے، تو اس کی بارانِ رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچا دے؟ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: وحیِ الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا اور مُردہ زمین زندہ ہو گئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونک اٹھو کہ وحیِ الٰہی ظاہر ہوئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہو گئی؟

یہ اللہ کی طرف سے کتابِ (ہدایت) نازل کی جاتی ہے، جو عزیز اور حلیم ہے۔ بلاشبہہ ایمان رکھنے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں (معرفتِ حق کی) بیشمار نشانیاں ہیں۔ نیز تمہاری پیدائش میں اور ان چارپایوں میں، جنھیں اس نے زمین میں پھیلا رکھا ہے، اربابِ یقین کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

اسی طرح رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں اور
اس سرمایۂ رزق میں جسے وہ آسمان سے برساتا ہے اور زمین
مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور ہواؤں کے ردّ و بدل میں،
اربابِ دانش کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ (اے پیغمبر!)
یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو فی الحقیقت ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔
پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات رہ گئی ہے جسے
سُن کر یہ لوگ ایمان لائینگے؟ (۴۵ ۱ ا-۶)

سورۂ انعام میں ان لوگوں کا جو وحیِ الٰہی کے نزول پر متعجّب ہوتے ہیں، ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

اور اللہ کے کاموں کی انھیں جو قدر شناسی کرنی تھی، یقیناً
انھوں نے نہیں کی، جب انھوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے
کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ (۶ : ۹۱)

پھر تورات اور قرآن کے نزول کے ذکر کے بعد حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:

یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا
ہے (اور اس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) وہ زندہ کو مردہ
چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیا سے نکالنے والا ہے، ہاں! وہی تمھارا خدا ہے پھر
تم (اس سے رُوگردانی کر کے) کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو۔ ہاں،
وہی (پردۂ شب چاک کر کے) صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے،
وہی ہے جس نے رات کو راحت و سکون کا ذریعہ بنا دیا اور وہی
ہے کہ اس نے سورج اور چاند کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم
کر دی کہ حساب کا معیار بن گئی۔ یہ اُس عزیز و علیم کا ٹھہرایا ہوا
اندازہ ہے۔ اور (پھر دیکھو!) وہی ہے جس نے تمھارے لیے
ستارے پیدا کر دیے تاکہ خشکی و تری کی تاریکیوں میں ان سے

رہنمائی پاؤ ۔ بلاشبہہ ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں ہم نے
دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں!(۶ : ۹۵-۹۷)

یعنی جس پروردگارِ عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ تمام فیضان شب و روز دیکھ رہے ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمھاری جسمانی پرورش و ہدایت کے لیے تو یہ سب کچھ کرے، لیکن تمھاری روحانی پرورش و ہدایت کے لیے اس کے پاس کوئی سرو سامان نہ ہو؟ وہ زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے ۔ پھر کیا تمھاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دیگا؟ وہ ستاروں کی روشن علامتوں سے خشکی اور تری کی ظلمتوں میں رہنمائی کرتا ہے ۔ کیونکر ممکن ہے کہ تمھاری روحانی زندگی کی تاریکیو میں رہنمائی کی کوئی روشنی نہ ہو؟ تم، جو کبھی اس پر متعجب نہیں ہوتے کہ زمین پر کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان میں تارے چمک رہے ہیں، کیوں اس بات پر متعجب ہوتے ہو کہ خدا کی وحی نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو رہی ہے؟ اگر تمھیں تعجب ہوتا ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کو اس کی صفتوں میں اس طرح نہیں دیکھا ہے، جس طرح دیکھنا چاہیے ۔ تمھاری سمجھ میں یہ بات تو آجاتی ہے کہ وہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لیے یہ پورا کارخانۂ حیات سرگرم رکھے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے سلسلۂ وحی و تنزیل قائم ہو۔

نظامِ ربوبیت سے وجودِ معاد پر استدلال اسی طرح وہ اعمالِ ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کرتا ہے ۔ جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے ۔ اور بہتر صناع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال اور مقصد رکھتا ہو۔ پس انسان جو کرۂ ارض کی بہترین مخلوق اور اس کے تمام سلسلۂ خلقت کا خلاصہ ہے اور جس کی جسمانی اور معنوی نشو و نما کے لیے فطرتِ کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے ہی

بنایا گیا ہو اور کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ اور پھر اگر خالق کائنات "رب" ہے اور کامل درجے کی ربوبیت رکھتا ہے، تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی پروردہ ہستی کو محض اس لیے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے!

> کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائنات ہستی کا حقیقی حکمران ہے، اس سے بہت بلند ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہانداری کے) عرش بزرگ کا پروردگار ہے۔ (۲۳ - ۱۱۵ - ۱۱۶)

ہم نے یہ مطلب اسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے، لیکن یہی مطلب علمی بحث و تقریر کے پیرایے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وجودِ انسانی کرۂ ارضی کے سلسلۂ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے اور اگر پیدائش حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی "تاریخ" پر نظر ڈالی جائے، تو ایک ناقابلِ شمار مدت کے مسلسل نشو و ارتقا کی "تاریخ" ہو گی۔ گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرۂ ارض پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے، وہ انسان ہے!

ماضی کے ایک نقطۂ بعید کا تصور کرو! جب ہمارا یہ کرہ سورج کے ملتہب کرّے سے الگ ہوا تھا، نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشو و نما پا سکیں! اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشو و نما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین بیج وجود میں آ سکا جسے پروٹوپلازم (Protoplasm) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے! پھر حیاتِ عضوی کے نشو و نما کا دور شروع ہوا اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب

تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں! یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلۂ ارتقا وجودِ انسانی تک مرتفع ہوا پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طول طویل مدّت اس پر گزر گئی! بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقا کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہوسکا جو کرۂ ارضی کے تاریخی عہد کا متمدّن اور عقیل انسان ہے!

گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گزر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے، وہ تمام تر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگزشت ہے!

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لیے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے، کیا یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیے اور مر کر فنا ہوجائے؟

اللہ کہ بادشاہ حقیقی ہے، ایسی بات کرنے سے پاک و بلند ہے۔
وہ کہ کوئی معبود نہیں مگر اس کی ایک ذات، جہانداری کے تخت
عزّت کا مالک! (۲۳ : ۱۱۶)

قدرتی طور پر یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوجاتا ہے! اگر وجودِ حیوانی اپنے ماضی میں ہمیشہ یکے بعد دیگرے متغیّر ہوتا اور ترقی کرتا رہا ہے، تو مستقبل میں بھی یہ تغیّر و ارتقا کیوں جاری نہ رہے؟ اگر اس بات پر ہمیں بالکل تعجّب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بیشمار صورتیں مٹیں اور نئی زندگیاں ظہور میں آئیں، تو اس بات پر کیوں تعجّب ہو کہ موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے، اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر صورت اور زندگی ہے؟

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائیگا (اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی)؟ کیا اس پر یہ حالت نہیں گزر چکی ہے کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا، پھر نطفہ سے علقہ ہوا

یعنی جونک کی سی شکل ہوگئی) پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول)
پیدا کیا گیا، پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا
گیا! (۷۵: ۳۶ - ۳۸)

سورۂ ذاریات میں تمامتر "دین" یعنی جزا کا بیان ہے:
اور پھر اس پر اعمالِ ربوبیت سے یعنی ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے مؤثرات سے
استشہاد کیا گیا ہے: (۵۱: ۱ - ۴)
پھر آسمان اور زمین کی بخشائشوں پر اور خود وجودِ انسانی کی اندرونی شہادتوں پر
توجہ دلائی ہے:
اس کے بعد فرمایا:

آسمان اور زمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان و زمین کے پروردگار
کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے) کہ بلاشبہ وہ معاملہ (یعنی
جزا و سزا کا معاملہ) حق ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ بات کہ
تم گویائی رکھتے ہو۔ (۵۱: ۲۰ - ۲۳)

اس آیت میں اثباتِ جزا کے لیے خدا نے خود اپنے وجود کی قسم کھائی ہے، لیکن "رب"
کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا ہے۔ عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات
پر کسی بات سے شہادت لائی جائے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ پروردگارِ عالم کی پروردگاری
شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حق ہے۔ یہ شہادت کیا ہے؟ وہی ربوبیت کی شہادت
ہے۔ اگر دنیا میں پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے، اور اس لیے پروردگار
بھی موجود ہے، تو ممکن نہیں کہ جزا کا معاملہ بھی موجود نہ ہو اور وہ بغیر کسی نتیجہ کے
انسان کو چھوڑ دے۔ چونکہ لوگوں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی، اس لیے اس آیت
میں قسم اور مقسم بہ کا ربط صحیح طور پر متعین نہ کر سکے۔
قرآنِ حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی
چاہیے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا طریقہ نہیں ہے، جس

کے لیے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اثباتِ مدعا کی شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ براہِ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوبِ بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوبِ خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے، یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ ایسا بول جاتا ہے کہ اس کی تعبیر ہی میں اس کی دلیل بھی موجود ہوتی ہے اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک واضح مثال یہی صفتِ ربوبیت کا جابجا استعمال ہے۔ جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہوا اسے "رب" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے تو یہ بات کہ وہ "رب" ہے، جس طرح اس کی ایک صفت ظاہر کرتی ہے اسی طرح اس کی دلیل بھی واضح کر دیتی ہے۔ وہ "رب" ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس کی ربوبیت تمھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور خود تمھارے دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے، پھر کیونکر تم جرأت کر سکتے ہو کہ اس کی ہستی سے انکار کرو! وہ رب ہے، اور رب کے سوا کون ہو سکتا ہے جو تمھاری بندگی و نیاز کا مستحق ہو۔

چنانچہ قرآن کے وہ تمام مقدمات جہاں اس طرح کے مخاطبات ہیں کہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُمُ (۲ : ۲۱)[1]؛ اُعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ (۵ : ۲، و ۱۱۷)[2]؛ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ (۳ : ۵۱)[3] ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ (۱۰ : ۳)[4]؛ اِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱ : ۹۲)[5]؛ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا

---

[1] اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

[2] خدا کی بندگی کرو جو میرا اور تمھارا (یعنی سب کا) پروردگار ہے۔

[3] دیکھو، اللہ میرا اور تمھارا (سب کا) پروردگار ہے۔ پس اس کی بندگی کرو۔

[4] یہ ہے اللہ تمھارا پروردگار، پس اسی کی بندگی کرو۔

[5] (ان تمام رسولوں کے ذریعہ ہم نے جو تعلیم دی تھی، وہ یہی تھی کہ) یہ تم سب

فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۲ : ۱۳۹) وغیرہا[۵۶]

تو انھیں مجرّد امر و خطاب ہی نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ وہ خطاب و دلیل دونوں ہیں کیونکہ "رب" کے لفظ نے برہان ربوبیت کی طرف خود بخود رہنمائی کر دی ہے۔ افسوس ہے، ہمارے مفسّروں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی، کیونکہ منطقی استدلال کے استغراق نے انھیں قرآن کے طریقِ استدلال سے بے پروا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقامات کے ترجمہ و تفسیر میں قرآن کے اسلوب بیان کی حقیقی روح واضح نہ ہو سکی، اور استدلال کا پہلو طرح طرح کی توجیہات میں گم ہو گیا۔

(بقیہ گزشتہ

کی امّت فی الحقیقت ایک ہی امّت ہے (الگ الگ دین اور الگ الگ گروہ بندیاں نہیں ہیں) اور تم سب کا (تنِ تنہا) پروردگار ہوں۔ پس چاہیے کہ میری ہی بندگی کرو (اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو)

۵۶ (اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہو (ہماری راہ تو خدا پرستی کی راہ ہے، پھر) کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ (یعنی خدا پرستی کے شیوے ہی سے تمھیں اختلاف ہے) حال آنکہ ہمارا اور تمھارا دونوں کا پروردگار وہی ہے۔

قولِ فیصل

الحمد للہ وحدہ

عارضی وقفہ

میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے، نہ طلب ہے، نہ شکایت ہے۔ یہ ایک موڑ ہے، جس سے گزرے بغیر ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف یہاں دم لے لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کہ کوئی نان آپریٹر کسی طرح کا بھی حصّہ عدالت کی کارروائی میں لے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سنٹرل خلافت کمیٹی، اور جمعیتہ العلماء ہند نے اگرچہ اس کی اجازت دے دی ہے کہ پبلک کی واقفیت کے لیے تحریری بیان دیا جا سکتا ہے، لیکن ذاتی طور پر میں لوگوں کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ خاموشی کو ترجیح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس لیے بیان دیتا ہے کہ مجرم نہیں، اگرچہ اس کا مقصد پبلک کی واقفیت ہو، تاہم وہ اشتباہ سے محفوظ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچاؤ کی ایک ہلکی سی خواہش اور سماعت حق کی ایک کمزور سی توقع اس کے اندر کام کر رہی ہو۔ حالانکہ نان کوآپریشن کی راہ بالکل

قطعی اور یکسوُ ہے۔ وہ اس بارے میں اشتباہ بھی گوارا نہیں کرسکتی۔

کامل مایوسی، اس لیے کامل تبدیلی کا عزم:

نون کوآپریشن" موجودہ حالت سے کامل مایوسی کا نتیجہ ہے، اور اسی مایوسی سے کامل تبدیلی کا عزم پیدا ہوا ہے۔ ایک شخص جب گورنمنٹ سے نون کوآپریشن کرتا ہے، تو گویا اعلان کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہو چکا۔ وہ اس کی غیر منصف طاقت کے جواز سے منکر ہے، اور اسی لیے تبدیلی کا خواہشمند ہے۔ پس جس چیز سے وہ اس درجہ مایوس ہو چکا کہ تبدیلی کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا، اس سے کیونکر امید کرسکتا ہے کہ ایک منصف اور قابلِ بقا طاقت کی طرح اس کے ساتھ انصاف کرے گی؟ اس اصولی حقیقت سے اگر قطع نظر کرلیا جائے۔ جب بھی موجودہ حالت میں بریّت کی امید رکھنا ایک بیسود زحمت سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ گویا اپنی معلومات سے انکار ہوگا۔ گورنمنٹ کے سوا کوئی ذی حواس اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ بحالتِ موجودہ سرکاری عدالتوں سے انصاف کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایسے اشخاص سے مرکب ہیں، جو انصاف کرنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسے نظام (سسٹم) پر مبنی ہیں جن میں رہ کر کوئی مجسٹریٹ اُن ملزموں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا، جن کے ساتھ خود گورنمنٹ انصاف کرنا پسند نہ کرتی ہو۔

میں یہاں واضح کردینا چاہتا ہوں کہ "نان کوآپریشن" کا خطاب صرف گورنمنٹ، گورنمنٹ کے سسٹم، اور موجودہ حکومتی اور قومی اصولوں سے ہے۔ افراد و اشخاص سے نہیں۔

عدالت گاہ ناانصافی کا قدیم ترین ذریعہ ہے:

ہمارے اس دَور کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اُٹھائے ہیں، تو

عدالتگاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بخیطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف و نا انصافی دونوں کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل و حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور نا انصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخِ عالم کی سب سے بڑی نا انصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیانِ مذہب سے سائنس کے محققین اور مکتشفین تک، کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے، جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہہ زمانے کے انقلاب سے عہدِ قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنہ متوسطہ (مڈل ایجز) کی پراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی۔ لیکن میں یہ ماننے کے لیے طیار نہیں کہ جو جذبات اُن عدالتوں میں کام کرتے تھے، ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے، لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور نا انصافی کے رازوں کا دفینہ ہیں؟

ایک عجیب مگر عظیم الشان جگہ

عدالت کی نا انصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں، جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے، جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اسی میں فلورنس کے فدا کارِ حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے، جو

اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا، کیونکہ میرے اعتقاد میں ایک مقدس انسان تھے، جو نیکی اور محبت کا آسمانی پیام لے کر آئے تھے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ تاہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے، جہاں سب سے اچھے اور سب سے بڑے، دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں؟ اتنی بڑی ہستی کے لیے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں۔

حمد و شکر!

اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصے میں آئی ہے، تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے، اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہوں۔ ان کو اپنی خوابگاہِ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش، غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے! اگر ایسا ہوتا، تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے!

میں بیان کیوں دیتا ہوں؟

بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ بیان دوں۔ لیکن ۶ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا، تو میں نے دیکھا، گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملے میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے۔ حالانکہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیے۔

پہلے میرے خلاف دفعہ ۱۲۴-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لیکن جب

اس کا ویسا ثبوت بھی بہم نہ ہو سکا، جیسا آج کل اثباتِ جُرم کے لیے کافی تصوّر کیا جاتا ہے، تو مجبوراً واپس لے لی گئی۔ اب ۱۲۴۔الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مقصد برآری کے لیے کافی نہیں کیونکہ جو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، وہ ان بہت سی باتوں سے بالکل خالی ہیں، جو میں اپنی بیشمار تقریروں اور تحریروں میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور جو شاید گورنمنٹ کے لیے زیادہ کارآمد ہوتیں۔ یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا، وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں، اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی، اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں میں جانتا ہوں کہ قانونِ عدالت کی رُو سے یہ میرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ میری جانب سے پراسیکوشن کے لیے یہی بہت بڑی مدد ہے کہ میں نے ڈیفینس نہیں کیا۔ لیکن حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے۔ یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا کہ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کر سکا۔

اقرارِ جُرم:

(۱) ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی، ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا اقتدار ملک وقوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشوونما اور آزادی و انصاف کی جدوجہد کو مبغوض رکھتا ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اُس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہے، اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کر سکتا، اگرچہ از روے انصاف کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ گویا تنازع للبقاء (Struggle for Existance) کی ایک جنگ ہوتی ہے۔ جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہے کہ اپنا حق حاصل کرے۔ قابض طاقت چاہتی ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ کہا جا سکتا ہے کہ

پہلے فریق کی طرح آخرالذکر بھی قابلِ ملامت نہیں کیونکہ وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہو۔ ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کر سکتے؟ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح بُرائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابلِ ملامت ہو، لیکن زندگی کی خواہش تو قابلِ ملامت نہیں ہے۔

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدّوجہد جرم ہو، اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے، جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں، بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے، اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں، جس نے سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی، اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے انھیں مبتلا کر رکھا تھا۔ پس اگر گورنمنٹ مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس لیے سزا دلانا چاہتی ہے، تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو۔

میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ فرشتہ کی طرح معصوم ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے کیونکہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ پھر میں کیوں امید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی، جو کر رہی ہے، اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلہ میں کیا ہے۔ پس یہ ایک ایسا قدرتی معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کے لیے شکوہ و شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ دونوں کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیے۔

گورنمنٹ بنگال اور میری گرفتاری :

(۲) میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا معاملہ جو کچھ تھا، گورنمنٹ آف انڈیا سے تھا۔ وہ کسی خاص معیّن الزام کی بنا پر نہیں، بلکہ موجودہ تحریک کی عام مشغولیت کی وجہ سے مجھے گرفتار کر سکتی تھی، اور جیسا کہ قاعدہ ہے گرفتاری کے لیے کوئی حیلہ پیدا کر لیتی ہے۔ چنانچہ ملک میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ علی برادران سے مجھے زیادہ مہلت دی گئی، مگر اب زیادہ عرصہ تک تغافل نہیں کیا جائیگا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ گورنمنٹ بنگال کے سامنے اس وقت میرا معاملہ نہ تھا۔ نہ وہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ اس دفعہ کے ثبوت میں جو تقریریں پیش کی گئی ہیں، وہ نصف سال پہلے کلکتہ میں کی گئی ہیں، اور گورنمنٹ نے مقدمہ کی اجازت ۲۲ دسمبر کو دی ہے۔ یعنی میری گرفتاری سے بارہ دن بعد۔ اگر فی الواقع ان تقریروں میں سڈیشن تھا، تو کیوں مجھے چھ ماہ تک گرفتار نہیں کیا گیا؟ اور اب گرفتار کیا بھی تو گرفتاری کے بارہ دن بعد؟ ہر شخص ان دو واقعات سے صاف صاف سمجھ سکتا ہے کہ صورتِ حال کیا ہے؟ خصوصاً جب یہ تیسرا واقعہ بھی بڑھا دیا جائے کہ ابتدا میں جو دفعہ ظاہر کی گئی، وہ ۱۲۴ نہ تھی، ۱۷ ترمیم ضابطۂ فوجداری تھی۔ پچیس دن کے بعد مجھ سے کہا جاتا ہے کہ وہ واپس لے لی گئی ہے!

گرفتاری کا اصلی باعث

حقیقت یہ ہے کہ میری گرفتاری میں اس دفعہ کو کوئی دخل نہیں۔ یہ قطعی ہے کہ مجھے انہی حالات کے سلسلہ میں گرفتار کیا گیا جو ۱۷ نومبر کے بعد رونما ہوئے ہیں۔ اگر میں پہلی دسمبر کو کلکتہ نہ آتا، یا ۱۰ دسمبر سے پہلے باہر چلا جاتا جس کی جلسۂ جمعیۃ العلماء بدایوں کی وجہ سے توقع تھی، تو گورنمنٹ بنگال مجھ سے کوئی تعرض نہ کرتی۔ ۱۷ دسمبر کے بعد دنیا کی تمام چیزوں میں سے جو چاہی جاسکتی ہیں، وہ صرف یہ چاہتی

تھی کہ ۲۴ نومبر کو جب پرنس کلکتہ پہنچیں تو ہڑتال نہ ہو۔ اور جو جابرانہ بیوقوفی ترمیم ضابطۂ فوجداری سنہ ۱۹۰۸ء کے نفاذ میں ہوگئی ہے، وہ ایک دن کے لیے بھی قبول کرلی جائے۔ وہ خیال کرتی تھی کہ میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی موجودگی اس میں حارج ہے، اس لیے کچھ عرصہ کے تذبذب اور غور وفکر کے بعد ہم دونوں گرفتار کرلیے گئے۔ گرفتاری بلاوارنٹ کے ہوئی تھی، لیکن جب دوسرے دن ضابطہ کی نمایش پوری کرنے کے لیے مجسٹریٹ جیل میں بھیجا گیا، تو مسٹر داس کی طرح میری گرفتاری کے لیے بھی دفعہ ۱۷ (۲) ترمیم ضابطۂ فوجداری کے ماتحت وارنٹ پیش کیا گیا۔

میں گزشتہ دو سال کے اندر بہت کم کلکتہ میں رہ سکا ہوں۔ میرا تمام وقت زیادہ تر تحریکِ خلافت کی مرکزی مشغولیت میں صرف ہوا۔ یا ملک کے پیہم دوروں میں۔ اکثر ایسا ہوا کہ مہینے دو مہینے کے بعد چند دنوں کے لیے کلکتہ آیا اور بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کرکے پھر باہر چلا گیا۔ وسط نومبر سے بھی میں سفر میں تھا۔ ۱۶ کو کلکتہ سے روانہ ہوا تاکہ جمعیۃ العلما ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں شریک ہوں۔ وہاں مہاتما گاندھی کے تار سے بمبئی کی شورش کا حال معلوم ہوا اور میں بمبئی چلا گیا۔ جنوری تک میرا ارادہ واپسی کا نہ تھا کیونکہ ۱۰ دسمبر کو جمعیۃ العلماء کا اسپیشل اجلاس بدایوں میں تھا۔ اس میں شرکت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ مجھے تمام وقت انگورہ فنڈ کی فراہمی میں صرف کرنا تھا۔ لیکن یکایک گورنمنٹ بنگال کے تازہ جبر وتشدد اور ۱۸ کے کیپٹنگ کی اطلاع بمبئی میں ملی، اور میرے لیے ناممکن ہوگیا کہ ایسی حالت میں کلکتہ سے باہر رہوں۔ میں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے تمام پروگرام ملتوی کرکے کلکتہ چلا جانا چاہیے۔ زیادہ خیال مجھے اس بات کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، گورنمنٹ کا جبر وتشدد لوگوں کو بے قابو کردے اور وہ کوئی بات صبر وضبط کے خلاف کر بیٹھیں۔ علی الخصوص جب کہ "سول گارڈ" کے قیام کی خبریں بھی آچکی تھیں، اور اس بارے میں ہمیں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی

تھی کہ یہ نئی اسلحہ بندی کن شریفانہ اور پُرامن اغراض کے لیے وجود میں آئی ہے؟
میں پہلی دسمبر کو کلکتہ پہنچا۔ میں نے ظلم اور برداشت، دونوں کے انتہائی مناظر اپنے سامنے پائے۔
میں نے دیکھا کہ ۱۷ نومبر کی یادگار ہڑتال سے بے بس ہو کر گورنمنٹ اس آدمی کی طرح ہو گئی ہے جو جوش اور غصہ میں آپے سے باہر ہو جائے، اور غیظ و غضب کی کوئی حرکت بھی اس سے بعید نہ ہو۔ ۱۹۰۸ء کے کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے تحت قومی رضاکاروں کی تمام جماعتیں "مجمع خلافِ قانون" (اَن لافُل) قرار دے دی گئی ہیں۔ پبلک اجتماعات یکقلم روک دیے ہیں، قانون صرف پولیس کی مرضی کا نام ہے، وہ اَن لافُل جماعت" کی تفتیش اور شبہہ میں جو چاہے کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ راہ چلتوں کی جان و آبرو بھی محفوظ نہیں۔ گورنمنٹ نے پہلے ۱۸ نومبر کے کمیونک میں صرف سابق و موجود رضاکار جماعتوں کا ذکر کیا تھا، لیکن ۲۴ کو دوسرا کمیونک جاری کر کے تمام آیندہ جماعتیں بھی خلاف قانون قرار دے دیں، اور پولیس نے بلا امتیاز ہر شخص کو، جو اس کے سامنے آگیا، گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ کوئی بات بھی جس سے ۲۴ کی ہڑتال کے کمزور ہونے کا امکان ہو، پولیس اور پولیس سے بھی زیادہ شریف قوم "سول گارڈ" کے لیے ناجائز نہیں۔ سول گارڈ گویا قومی رضاکاروں کا جواب ہے۔ وہ بالکل نہتے ہونے پر بھی "جبر و تشدد" سے ہڑتال کرا دیتے تھے۔ یہ ریوالور سے مسلح ہونے پر بھی "امن و صلح" کے ذریعہ ہڑتال روک دینگے!
اس کے مقابلہ میں لوگوں نے بھی برداشت اور استقامت، دونوں کا گویا آخری عہد کر لیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اپنی راہ سے ہٹینگے، نہ تشدد کا مقابلہ کرینگے۔
ان حالات میں میرے لیے فرض کی راہ بالکل صاف اور یکسو تھی۔ میں نے اپنے سامنے دو حقیقتیں بے نقاب دیکھیں۔ ایک یہ کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے اس لیے فتح و شکست کا پہلا فیصلہ یہی ہوگا۔ دوسری یہ کہ ہم کل تک پوری آزادی

کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے۔ لیکن موجودہ حالت نے بتلا دیا کہ ہماری آزادی کی مبادیات تک محفوظ نہیں ہیں۔ آزادیِ تقریر اور آزادیِ اجتماع، انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر مِل کی زبان میں "انسانیت کے قتلِ عام سے کچھ ہی کم" کہی جاسکتی ہے! لیکن یہ پامالی بلا کسی جھجک کے علانیہ ہو رہی ہے۔ بس میں نے باہر کا تمام پروگرام منسوخ کر دیا، اور فیصلہ کر لیا کہ اس وقت تک کلکتہ ہی میں رہونگا' جب تک دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ظہور میں نہ آجائے یا گورنمنٹ اپنا کمیونک اور آرڈر واپس لے لے، یا مجھے گرفتار کرلے۔

گورنمنٹ نے ۱۰ دسمبر کو مجھے گرفتار کرلیا۔ میں پورے اطمینان اور مسرت کے ساتھ جیل کی طرف روانہ ہوا کیونکہ میں اپنے پیچھے ایک فتحمند میدان چھوڑ رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ کلکتہ اور بنگال نے میری توقعات پوری کردیں وہ پہلے جس قدر پیچھے تھا، اتنا ہی آج سب سے آگے ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کامیابی کے لیے گورنمنٹ کی امداد کا ہمیں پوری طرح اعتراف کرنا چاہیے۔ اگر وہ ۱۷ نومبر کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتی، تو فی الواقع ہمارے لیے آیندہ کاموں کے انتخاب میں چند در چند مشکلات تھیں۔ ہم ۲۲ کو بمبئی میں انہی مشکلات پر باہم غور و خوض کر رہے تھے۔

دو حقیقتیں:

حقیقت یہ ہے کہ ان گزشتہ ایام نے بہ یک وقت دونوں حقیقتیں صفحاتِ تاریخ کے لیے مہیا کر دیں۔ اگر ایک طرف گورنمنٹ کے چہرے سے اِدّعا و نمایش کے تمام نقاب دور ہو گئے، تو دوسری طرف ملکی طاقت بھی ایک سخت آزمایش میں پڑ کر پوری طرح نمایاں ہوگئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ اگر گورنمنٹ ہر طرح کے جبر و تشدد میں بالکل بیحجاب اور بے لگام ہے، تو ملک میں بھی صبر و برداشت کی طاقت روز افزوں نشو و نما پا رہی ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ انکار کیا گیا ہے، آج بھی اس کا موقعہ حاصل ہے کہ انکار کر دیا جائے، لیکن کل تاریخ کے لیے یہ ایک نہایت ہی عبرت انگیز داستان ہوگی۔ یہ مستقبل کی رہنمائی کریگی

کہ کیونکر اخلاقی مدافعت مادّی طاقت کے جارحانہ گھمنڈ کو شکست دے سکتی ہے؟ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ صرف برداشت اور قربانی کے ذریعہ خونریز اسلحہ کا مقابلہ کیا جائے؟ البتہ میں نہیں جانتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے کس فریق کے اندر اس بڑے انسان کی تعلیم تلاش کی جائے جو برائی کے مقابلہ میں صبر و عفو کی تعلیم لے کر آیا تھا؟ گورنمنٹ میں یا ملک میں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ بیوروکریسی کے حکام اس کے نام سے ناواقف نہ ہونگے۔ اس کا نام "مسیح" تھا۔

گورنمنٹ کا فیصلہ اور شکست

(۳) فلسفۂ تاریخ ہمیں تبلاتا ہے کہ نادانی اور ناعاقبت اندیشی ہمیشہ زوال پذیر طاقتوں کی رفیق ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے خیال کیا کہ وہ جبر و تشدد سے تحریک خلافت و سوراج کو پامال کردیگی، اور ۲۴ (نومبر) کی ہڑتال رُک جائیگی۔ اس نے والنٹیر کورز کو خلافِ قانون قرار دیا، اور بلا امتیاز تمام کارکن گرفتار کرلیے گئے۔ وہ سمجھتی تھی والنٹیرز کی ممانعت اور کارکنوں کی گرفتاری کے بعد خلافت اور کانگریس کا نظام معطّل ہو جائیگا، اور اس طرح خود بخود ہڑتال رُک جائیگی۔ لیکن بہت جلد گورنمنٹ کو معلوم ہوگیا کہ جبر و تشدد جب قومی بیداری کے مقابلہ میں نمایاں ہو، تو وہ کوئی مہلک چیز نہیں ہوتی۔ نہ تو ہڑتال رُک سکی نہ خلافت اور کانگریس کمیٹیاں معطّل ہوئیں، اور نہ والنٹیرز کا کام ایک دن کے لیے بھی بند ہوا، بلکہ ہماری غیر موجودگی میں یہ ساری چیزیں زیادہ طاقتور اور غیر مسخّر ہوگئیں۔ میں نے ۸ ڈسمبر کو جو پیغام ملک کے نام لکھا تھا، اس میں گورنمنٹ بنگال کے لیے بھی یہ پیغام تھا: "میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی گرفتاری کے بعد کام زیادہ طاقت اور مستعدی کے ساتھ جاری رہیگا، اور ۲۴ کو ہڑتال اس سے زیادہ مکمل ہوگی، جس قدر ہماری موجودگی میں ہوسکتی تھی"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گورنمنٹ خود اپنے پسند کیے ہوئے میدان میں ہار گئی۔ اب وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، اور جن لوگوں کو گرفتار کرچکی ہے، انھیں کسی نہ کسی

طرح سزا دلانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ بالکل بیسود ہے۔ طاقتور آدمی کو شکست کے بعد زیادہ غصہ آتا ہے، لیکن کوئی شکست اس لیے فتح نہیں بن جاسکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجلا سکتے ہیں!

دفعہ ۱۲۴ - الف:

غرضکہ میری گرفتاری صریح طور پر انہی واقعات کا نتیجہ ہے، اور اسی لیے دو ہفتہ تک میرے خلاف دفعہ ۱۷ ترمیم ضابطۂ فوجداری ہی کا دعویٰ قائم رہا۔ لیکن جب اس بارے میں کوئی سہارا نہ ملا، تو میرے پریس اور مکان کی تلاشی لی گئی، تاکہ میری کوئی تحریر حاصل کر کے بنائے مقدمہ قرار دی جائے۔ جب وہاں سے بھی کوئی مواد ہاتھ نہ آیا تو مجبوراً سی، آئی، ڈی کے محفوظ ذخیرے کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ ذخیرہ ہمیشہ اس شریفانہ کام کے لیے مستعد رہتا ہے، اور ضرورت کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ پس اس طرح بہ ہزار زحمت دفعہ ۱۲۴ - الف کا دعویٰ تیار ہو گیا۔

اجتماع ضدّین

(۳۴) یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی منافقانہ روش کی وجہ سے پیش آرہی ہے۔ ایک طرف تو وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بیدریغ جبر و تشدّد کرے۔ دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائشی قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے۔ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں؛ جمع نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی و درماندگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ جو لوگ اس کے خیال میں سب سے زیادہ مستحق تعزیر ہیں، انہی کو سزا دلانا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ابھی چند ہی مہینے گزرے ہیں کہ ہم کراچی میں گورنمنٹ کی سراسیمگی و درماندگی کا مضحکہ انگیز تماشا دیکھ رہے تھے۔ جو سرکاری استغاثہ اس دعویٰ اور اہتمام کے ساتھ شروع کیا گیا تھا، اس سے خود گورنمنٹ کی پسندیدہ اور انتخاب کردہ جیوری بھی اتفاق نہ کر سکی!

لطف یہ ہے کہ یہ مشکلات گورنمنٹ کو ایسی حالت میں پیش آرہی ہیں جب کہ وہ جانتی ہے کہ نان کوآپریٹرز کی جانب سے ڈیفنس نہیں کیا جائیگا، اور سخت سے سخت غلط بیانی اور قانون شکنی کی حالت میں بھی پردہ دری اور شکست کا کوئی کھٹکا نہیں ہے۔

نئی قانونی تشریحات

گورنمنٹ نے اس اطمینان سے پوری طرح کام لینے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے نان کوآپریٹرز کے مقدمات آج کل جس طرح چکائے جارہے ہیں، اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ "لا" اور "آرڈر" کے معنی بیوروکریٹک اصطلاح میں کیا ہیں؟ "لا" اور "آرڈر" کی طرح اب دعویٰ، ثبوت، شہادت، تشخیص (آئی ڈینٹی فائی) وغیرہ تمام عدالتی مصطلحات کے معنی میں بھی انقلاب ہوگیا ہے۔ گویا نان کوآپریٹرز کو جلد سزا دینے کے لیے ہر طرح کی بیقاعدگی اور قانون شکنی جائز ہے۔ حتیٰ کہ اس بات کی بھی تحقیق ضروری نہیں کہ جس انسان کے ملزم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، کٹہرے کا ملزم وہی آدمی ہے بھی یا نہیں؟ ابھی اسی ہفتہ جوڑابگان کی عدالت سے ایک شخص "عبدالرحمن ہاشم" کو اس پُرزور قانونی اور منطقی ثبوت پر چھ ماہ کی سزا دی ہے کہ "اعظم ہاشم" نامی ایک خلافت والنٹر دنیا میں وجود رکھتا ہے، اور دونوں کے نام میں لفظ "ہاشم" مشترک ہے! خود میرے مقاصد میں جو صریح بے ضابطگیاں کی گئی ہیں، ان کا ذکر لاحاصل سمجھ کر نہیں کرنا چاہتا، ورنہ وہی اس حقیقت کے انکشاف کے لیے کافی تھیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کا ذکر کرونگا، جو بیقاعدگی اور غلط بیانی، دونوں کا مجموعہ ہے۔ مجھے دفعہ ۱۷۔ ترمیم ضابطۂ فوجداری سے بری کردیا گیا، اور ۱۲۴۔الف کے ماتحت وارنٹ حاصل کیا گیا۔ قاعدہ کی رو سے رہائی اور از سر نو گرفتاری، دونوں باتیں وقوع میں آنی چاہیے تھیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۲۴ کا کوئی وارنٹ مجھ پر تعمیل نہیں کیا گیا حتیٰ کہ ۶ جنوری تک مجھے اس کا علم بھی نہیں ہوا۔ لیکن میرے سامنے مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر پولیس نے حلفیہ شہادت دی ہے کہ اس نے پریسڈنسی جیل میں مجھ پر

وارنٹ سرد کیا ہے!
یہ سچ ہے کہ نان کوآپریٹر کسی طرح کا ڈیفنس نہیں کرتے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے۔ اس لیے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کر لینگے۔ شریف آدمیوں نے تو سچ مچ آنکھیں بند کر لی ہیں، لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں!

قانون کا ڈرامہ :

فی الحقیقت "لا" اور "آرڈر" کا ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں۔
وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی۔ لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کرونگا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا سابق چیف جسٹس ہے!

میری تقریریں :

(۵) پراسیکیوشن کی جانب سے میری دو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، جو میں نے پہلی اور پندرھویں جولائی کو مرزا پور پارک کے جلسے میں کی تھیں۔ اُس زمانہ میں گورنمنٹ بنگال نے گرفتاریوں کی طرف پہلا قدم اُٹھایا تھا اور چار مبلغینِ خلافت پر مقدمہ چلا کر سزائیں دلائی تھیں۔ میں اُس وقت سفر سے بیمار واپس آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں میں بیحد جوش پھیلا ہوا ہے، اور ہر طرح کے مظاہرے کے لیے لوگ بیقرار ہیں۔ چونکہ میرے خیال میں گرفتاریوں پر مظاہرہ کرنا نان کوآپریشن کے اصول کے خلاف تھا، اس لیے میں نے ہڑتال اور جلوس یکقلم روک دیے۔ اس پر عوام کو شکایت ہوئی تو میں نے یہ جلسے منعقد کیے، اور لوگوں کو صبر و تحمل کی نصیحت کرتے ہوئے سمجھایا کہ نان وائلینس نان کوآپریشن کے اصول میں یہ بات داخل ہے کہ گرفتاریوں پر صبر و

سکون کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر فی الواقع ان گرفتاریوں کا تمھارے دل میں درد ہے تو چاہیے کہ اصلی کام کرو، اور بیرونی کپڑا ترک کر کے دیسی گاڑھا پہن لو۔
استغاثہ نے جو نقل پیش کی ہے، وہ نہایت ناقص، غلط اور مسخ شدہ صورت ہے، اور محض بے جوڑ اور بعض مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے، جیسا کہ اس کے پڑھنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ تاہم میں اس کے غلط اور بے ربط جملوں کو چھوڑ کر (کیونکہ اس کے اعتراف سے میرا ادبی ذوق اِبا کرتا ہے) باقی وہ تمام حصہ تسلیم کر لیتا ہوں جس میں گورنمنٹ کی نسبت خیالات کا اظہار ہے، یا پبلک سے گورنمنٹ کے خلاف جدّ و جہد کی اپیل کی گئی ہے۔
استغاثہ کی جانب سے صرف تقریریں پیش کر دی گئی ہیں، یہ نہیں بتلایا ہے کہ ان کے کن جملوں کو وہ ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہے؟ یا اس کے خیال میں "مائی ڈیر برادران" سے لے کر آخر تک سب ۱۲۴۔الف ہے؟ میں نے بھی دریافت نہیں کیا کیونکہ دونوں صورتیں میرے لیے یکساں ہیں۔ تاہم ان نقول کو دیکھتا ہوں تو استغاثہ کے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ قابلِ ذکر جملے حسبِ ذیل ہیں:

> ایسی گورنمنٹ ظالم ہے۔ جو گورنمنٹ ناانصافی کے ساتھ قائم ہو، ایسی گورنمنٹ کو یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیے، یا دنیا سے مٹا دینا چاہیے۔
>
> اگر فی الحقیقت تمھارے دلوں میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے، تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے۔ کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انھیں گرفتار کیا ہے، وہ اس برّ اعظم میں اسی طرح قائم رہے جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت تھی؟
>
> اگر تم ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہو، تو اس کا راستہ یہ ہے کہ جن چالاک دشمنوں کے پاس خونریزی کا بیشمار سامان موجود ہے، انھیں رائی برابر

بھی اس کے استعمال کا موقعہ نہ دو۔ اور کامل امن و برداشت کے ساتھ کام کرو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تقریروں میں کوئی ایسی بات کہی جاتی ہے، تو اس سے مقرّر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر لے، ورنہ اس کی دلی خواہش یہ نہیں ہوتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ آج تمھارے لیے کام کر رہے ہیں، تم میں سے کوئی آدمی بھی یہ ماننے کے لیے طیّار نہ ہوگا کہ وہ جیل جانے یا نظر بند ہونے سے ڈرتے ہیں۔ (پس) اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ امن و نظم کے ساتھ کام کرنا چاہیے، تو اُن کا مطلب یہ نہیں (ہوسکتا) کہ اس ظالمانہ گورنمنٹ (کے ساتھ) وفاداری کرنی چاہتے ہیں۔ جو گورنمنٹ، اس کی طاقت، اور (اس کا) تخت آج دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے، یقیناً وہ اس گورنمنٹ کے وفادار نہیں ہوسکتے۔

اس کے بعد میں نے کہا ہوگا، مگر کاپی میں نہیں ہے:
وہ تو صرف اس لیے یہ کہتے ہیں کہ خود تمھاری کامیابی با امن رہنے پر موقوف ہے۔ تمھارے پاس وہ شیطانی ہتھیار نہیں ہیں، جن سے یہ گورنمنٹ مسلّح ہے۔ تمھارے پاس صرف ایمان ہے، دل ہے، قربانی کی طاقت ہے۔ تم انہی طاقتوں سے (اصل میں "ہتھیاروں سے" ہوگا) کام لو۔ اگر تم چاہو کہ اسلحہ کے ذریعہ فتح کرو، تو تم نہیں کر سکتے۔ آج امن و سکون سے بڑھ کر (تمھارے لیے) کوئی چیز نہیں۔

اگر تم صرف چند گھڑیوں کے لیے گورنمنٹ کو حیران کرنا چاہتے ہو، تو اس کے لیے میرے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ میں اس گورنمنٹ کا استحکام چاہتا، تو وہ نسخے تبلا دیتا . . . . (لیکن)

میں تو ایسی جنگ چاہتا ہوں (جو) ایک ہی دن میں ختم نہ ہو جائے، بلکہ فیصلہ کے آخری دن تک (جاری رہے) اور جب فیصلہ کی گھڑی آجائے، تو پھر یا تو یہ گورنمنٹ باقی نہ رہے، یا تیس کروڑ (انسان) باقی نہ رہیں۔

جو الفاظ بریکٹ کے اندر ہیں، وہ تقریر کی پیش کردہ کاپیوں میں نہیں ہیں لیکن عبارت کے بامعنی ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ میں نے اس لیے تصیح کر دی کہ پراسیکیوشن کو استدلال میں مدد ملے۔ اگر اس کے مقصد کے لیے پوری تقریر کی تصیح و تکمیل ضروری ہو، تو میں اسی طرح کر دینے کے لیے تیار ہوں۔

ان کے علاوہ دونوں تقریروں میں لوگوں کو نان کوآپریشن کی دعوت دی ہے، مطالبات خلافت اور سوراج کو دُہرایا ہے، پنجاب کے مظالم کو وحشیانہ کہا ہے، لوگوں کو بتلایا ہے کہ جو گورنمنٹ جلیانوالہ باغ، امرتسر میں چند منٹوں کے اندر سیکڑوں انسانوں کو قتل کر ڈالے اور اس کو جائز فعل بتلائے، اس سے ناانصافی کی کوئی بات بھی بعید نہیں۔

اقرار:

(۶) میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف انہی دو موقعوں پر بلکہ گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بیشمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا، کہ وہ ۱۲۴ - الف کا جرم قرار دیا جائیگا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں، اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہونگا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔

موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے:

(۷) یقیناً میں نے کہا ہے: "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے"۔ لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔
میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں، یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو، میرے علم میں کوئی نہیں۔
میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے۔ اگر باز نہیں آسکتی، تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقاید کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہمعمر کہے جاسکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے، اُسے یا تو درست ہوجانا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے تیسری بات کیا ہوسکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں، تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

میرا یہ اعتقاد کیوں ہے؟

(۸) میرا اور میرے کروڑوں ہموطنوں کا ایسا اعتقاد کیوں ہے؟
اس کے وجوہ و دلائل اب اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ ملٹن کے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے: "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس"۔ محسوسات کے لیے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے کہ میں انسان ہوں۔

شخصی اقتدار بالذّات ظلم ہے:

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں

کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔
محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی
ہی ہے، اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس، میں موجودہ گورنمنٹ
کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں
کہ اس کی محکومی سے ملک وقوم کو نجات دلاؤں۔

"اصطلاحات" اور "بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور
قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے،
اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے۔ یہ کہنا
کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیے، بعینہ ایسی ہی ہے، جیسے کہا جائے کہ
مالک کو اس کی جایداد اور قرضدار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کرکے دینا چاہیے۔ میں
تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکے، تو قرضدار
کو یہی کرنا پڑیگا کہ قسط کی صورت میں وصول کرے۔ لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتا
ہوگا۔ اس سے بیک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو جا سکتا۔

"رفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان لیو ٹالسٹائی (Leo Talstoy) کے لفظوں
میں کہونگا: "اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے جیلر منتخب کر لینے کا اختیار مل جائے، تو اس
سے وہ آزاد نہیں ہو جائینگے؟"

میرے لیے اس کے اچھے برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود
اس کے وجود کا ہے۔ میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز
یقین کرتا ہوں۔ اگر وہ تمام ناانصافیاں ظہور میں نہ آتیں، جو اس کثرت سے واقع
ہو چکی ہیں، جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا۔ کیونکہ اس کی ہستی ہی سب سے
بڑی ناانصافی ہے، اور اس کی برائی کے لیے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اگر وہ
اچھے کام کرے، تو اس کی اچھائی تسلیم کر لی جائیگی، لیکن اس کا وجود ناجائز اور
ناانصافی ہی رہیگا۔ اگر ایک شخص ہماری جایداد پر قابض ہو کر بہت اچھے اور نیک

کام انجام دے، تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو جا سکتا۔ برائی بیں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے، لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے۔ یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے یا بُری ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ "زیادہ بُری چوری اور کم بُری چوری" لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ "اچھی چوری" اور "بُری چوری"؟ پس میں بیوروکریسی کے اچھائی اور جائز ہونے کا کسی حال میں بھی تصوّر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ فی نفسہٖ ایک ناجائز عمل ہے۔ البتّہ اس کی برائی کم اور زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی بیوروکریسی تو اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنی خلقی برائی ہی پر قانع رہتی۔ جب اس کی خلقی برائی پر اس کی بیشمار عملی برائیوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے، تو پھر کیونکر اس کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ظلم کا اعلان نہ کیا جائے؟

اسلام اور بیوروکریسی:

(۹) میں مسلمان ہوں، اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمّل نظام ہے، جو نوعِ انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خودغرض مذہبی پیشواؤں، اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غضب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے، اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب بیکقلم مٹا دیے، اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں، اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیارِ فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف عمل ہے۔ اور

سب سے بڑا وہی ہے، جس کے کام سب سے اچھے ہوں: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (سورۂ حجرات ۴۹: ۱۳)[ے]

اسلام ایک جمہوری نظام ہے:

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا، بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مشہور مؤرخ گبن کے لفظوں میں "اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا"۔ پیغمبر اسلام اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی، اور صرف قوم کی رائے، نیابت، اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے "بادشاہ" کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے، اور صرف ایک رئیسِ جمہوریہ (پریسیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی "خلیفہ" کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظامِ حکومت کے لیے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ (۴۲: ۳۸)

چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن میں موجود ہے۔ "شوریٰ" کے معنی باہم مشورہ کے ہیں یعنی جو کام کیا جائے، جماعت کے باہم رائے اور مشورہ سے کیا جائے۔ شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے؟

ے اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے گروہوں اور قبیلوں کی شکل میں پیدا کیا، تاکہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جا سکو۔ لیکن تم میں سے سب سے زیادہ قابلِ عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

قومی اور مسلم بیوروکریسی بھی ظلم ہے :

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں، جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیوروکریسی کیا حکم دیتی ہے؟ اگر آج ہندوستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے، مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو، یا چند حاکموں کی بیوروکریسی ہو، تو بہ حیثیت مسلمان ہوتے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا کہ اُس کو ظالم کہوں، اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔ اسلام کے علماء حق نے ہمیشہ جابر مسلمان بادشاہوں کے خلاف ایسا ہی اعلان و مطالبہ کیا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ نظام بعد کو قائم نہ رہ سکا۔ مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شہنشاہی کے پُر شوکت افسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ، جو بسا اوقات پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح ملبوس ہوتا تھا، انھوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی۔ تاہم تاریخ اسلام کا کوئی عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا ہے، جنھوں نے علانیہ حکام وقت کے استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو، اور اُن تمام تکلیفوں کو خوشی خوشی جھیل نہ لیا ہو، جو اس راہ میں پیش آئی ہیں۔

مسلمانوں کا قومی وظیفہ :

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دستبردار ہو جائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے، تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے۔ کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے، جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ جانتا ہے بیان کرے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے، ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمایش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دَور دورہ ہو جائے، اور جبر و تشدد کے ذریعہ اعلانِ حق کو روکا جائے، تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے، اور "دو اور دو کو اس لیے چار" نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرہ میں پڑ جائے، اور حق کے اُبھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ باقی نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدل جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے؟ وہ تو حقیقت ہے۔ اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے، اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائیگا، آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو جا سکتی!

شہادت علی النّاس

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں "شاہد" ہیں یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے، اور یہی ان کی قومی خصلت (نیشنل کیریکٹر) ہے جو ان کو تمام پچھلی اور آیندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ[1]! اسی طرح پیغمبر اسلام نے فرمایا "أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِي الْأَرْضِ[2]" (بخاری) تم خدا کی زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو۔ پس ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے، اس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

کتمانِ شہادت:

اگر وہ باز رہے، تو یہ قرآن کی اصطلاح میں "کتمانِ شہادت" ہے۔ یعنی گواہی کو چھپانا۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے۔ اور بار بار کہا ہے کہ اسی کتمانِ شہادت کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں برباد و ہلاک ہو گئیں: إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ[3] (بقرہ) لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ[4]!

---

[1] ہم نے تمھیں نیک ترین اُمت ہونے کا درجہ دیا' "تاکہ تم تمام انسانوں کے لیے سچائی کی گواہی دینے والے ہو (البقرہ ۲: ۱۴۳)

[2] تم دنیا میں خدا کی ہستی کے گواہ ہو

[3] جو لوگ (خوف یا طمع کے باعث) چھپاتے ہیں ان سچائی یا ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں، حال آنکہ ہم نے انھیں لوگوں کے لیے انھیں کھول کھول کر کتاب میں بیان کر دیا ہے، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں (البقرہ، ۲: ۱۵۹)

[4] بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے حق سے انکار کیا ان پر پہلے داؤد اور پھر عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز

امر بالمعروف و نہی عن المنکر :

اسی لیے اسلام کے واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض" امر بالمعروف" اور" نہی عن المنکر" ہے یعنی نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدۂ توحید کے بعد جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، ان میں سے ایک کام یہ ہے۔ قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے۔ وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اسی لیے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی کو روکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں، تو اپنی ساری بڑائی کھو دیں: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ[۵]

قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے: "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ دنیا کی کوئی لالچ اُن پر غالب آسکتی ہے، نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی رکھتے ہیں تو صرف خدا سے، اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے"

پیغمبر اسلام کے بیشمار قولوں میں سے جو اس بارے میں ہیں، ایک قول یہ ہے "نیکی کا اعلان کرو۔ برائی کو روکو۔ اگر نہ کرو گے تو ایسا ہوگا کہ نہایت بُرے لوگ تم پر حاکم ہو جائینگے اور خدا کا عذاب تمھیں گھیر لیگا۔ تم دعائیں مانگو گے کہ یہ حاکم ٹل جائیں مگر قبول نہ ہوگی" (ترمذی و طبرانی عن حذیفہ و عمر رض)

لیکن یہ فرض کیونکر انجام دیا جائے؟ تو اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین درجے بتلائے ہیں۔ چنانچہ پیغمبرِ اسلام نے فرمایا: تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے

(بقیہ حاشیہ) ———

کر گئے۔ وہ برائیوں میں پڑ کے پھر اس سے باز نہیں آئے۔ یہ کتنی بڑی برائی تھی جس میں وہ پڑ گئے۔ (المائدہ ۵، ۷۸ - ۷۹)

۵ تم تمام اُمتوں میں بہتر اُمت ہو تم نیکی کرنے کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے ہو (آلِ عمران ۳، ۱۱۰)

تو چاہیے، اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے، تو زبان سے اعلان کرے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے، تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے۔ لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے (مسلم) ہندوستان میں ہمیں یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے گورنمنٹ کی برائیاں دُور کر دیں۔ اس لیے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کیا جس کی استطاعت حاصل ہے۔ یعنے زبان سے اس کا اعلان کرتے ہیں۔

ارکانِ اربعہ:

قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے اور بتلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے: ایمان، عملِ صالح، توصیۂ حق، توصیۂ صبر۔

"توصیۂ حق" کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا "توصیۂ صبر" کے معنی یہ ہیں کہ ہر طرح کی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو جھیل لینے کی وصیت کرنا۔ چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں، اس لیے حق کے ساتھ صبر کی وصیت بھی ضروری تھی، "تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے لیے ہر حق گو طیار ہو جائے: وَالْعَصْرِ، إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[1]

اسلامی توحید اور امر بالمعروف:

اسلام کی بنیاد عقیدۂ "توحید" پر ہے اور "توحید" کا ضد "شرک" ہے، جس سے بیزاری

---

[1] قسم ہے زمانے کی کہ انسان (اپنی بے عملی کے باعث) بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے، جنھوں نے اچھے کام کیے، جو دوسروں کو سچائی پر قائم رہنے اور صبر کرنے کی نصیحت کرتے رہے (العصر، ۱۰۳)

اور نفرت ہر مسلمان کی فطرت میں داخل کی گئی ہے۔ توحید سے مقصود یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا۔ پس سچائی کے اظہار میں بیخوفی اور بے باکی ایک مسلمان زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھلاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کی سزاوار صرف خدا ہی کی عظمت و جبروت ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں، جس سے ڈرنا چاہیے یا جس کے آگے جھکنا چاہیے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا، خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا اور اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حقدار ماننا ہے۔ یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

اسی لیے اسلام تمام تر بیخوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جا بجا کہتا ہے: "مسلمان وہ ہے، جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ہر حال میں سچی بات کہے" (وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہ) پیغمبر اسلام نے فرمایا "سب سے بہتر موت اُس آدمی کی موت ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے" (ابو داؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد و قرار لیتے تھے، تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا "میں ہمیشہ حق کا اعلان کرونگا۔ خواہ کہیں ہوں، اور کسی حالت میں ہوں" (بخاری و مسلم)

اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخِ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔ اسلام کے عالموں پیشواؤں، بزرگوں، مصنفوں کے تراجم (Biography) تمام تر اسی قربانی کی سرگزشت ہیں!

جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں، مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں۔ ان کے لیے دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہو سکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے!

اسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔ نہیں:

"تاریخ اسلام کے دو دَور ہیں۔ پہلا دَور پیغمبرِ اسلام اور ان کے چار جانشینوں کا ہے۔

یہ دَور خالص اور کامل طور پر اسلامی نظام کا تھا۔ یعنی اسلامی جمہوریت (ری پبلک) اپنی اصلی صورت میں قائم تھی۔ ایرانی شہنشاہی اور رومی امارت (Aristocracy) کا کوئی اثر ابھی اسلامی مساوات عامّہ (Democracy) پر نہیں پڑا تھا۔ اسلامی جمہوریت کا خلیفہ خود بھی طبقۂ عوام (ڈیموکریٹ) کا ایک فرد ہوتا تھا، اور ایک عام فردِ قوم کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ دار الخلافت مدینے کے ایک خس پوش چھپّر میں رہتا تھا اور چار چار پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتا۔ اسلام کے دار الخلافت میں امریکن ری پبلک کا کوئی قصرِ سفید (وہائٹ ہاؤس) نہ تھا۔

دوسرا دَور شخصی حکمرانی اور شہنشاہی کا ہے، جو خاندان بنو اُمیّہ سے شروع ہوا۔ اس دَور میں اسلامی جمہوریت درہم برہم ہوگئی۔ قوم کے انتخاب کی جگہ طاقت و تسلّط کا دَور شروع ہوگیا۔ شاہی خاندان سے طبقۂ امراء (ارسٹوکریٹ) کی بنیاد پڑی، اور اسلام کے گلیم پوش خلیفہ کی جگہ شہنشاہیّت کا تاج و تخت نمودار ہوگیا۔

تاہم مسلمانوں کی زبانیں جس طرح پہلے دَور کی آزادی میں بے روک تھیں، اسی طرح دوسرے دَور کے جبر و استبداد میں بھی بےخوف رہیں۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ تعزیراتِ ہند (پینل کوڈ) کی طرح اسلامی قانون میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔ الف نہیں ہے۔

پہلے دَور کے مسلمانوں کی حق گوئی کا یہ حال تھا کہ دار الخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفۂ وقت سے برسرِ عام کہہ سکتی تھی "اگر تم انصاف نہ کرو گے، تو تکلے کی طرح تمہارے بل نکال دینگے"۔ لیکن وہ مقدّمۂ بغاوت چلانے کی جگہ خدا کا شکر کرتا کہ قوم میں ایسی راستباز زبانیں موجود ہیں! عین جمعہ کے مجمع میں جب خلیفہ منبر پر خطبہ کے لیے کھڑا ہوتا اور کہتا "اسمعوا و اطیعوا!" (سنو اور اطاعت کرو) تو ایک شخص کھڑا ہو جاتا اور کہتا "نہ تو سنینگے اور نہ اطاعت کرینگے"۔ "کیوں؟" "اس لیے کہ تمہارے جسم پر جو چغہ ہے وہ تمہارے حصّہ کے کپڑے سے زیادہ کا بنا ہوا ہے اور یہ خیانت ہے"۔ اس پر خلیفہ اپنے لڑکے سے گواہی دلاتا۔ وہ اعلان کرتا کہ میں نے اپنے حصّے کا کپڑا بھی اپنے باپ کو دے دیا تھا۔ اس سے چغہ طیار ہوا۔

قوم کا یہ طرزِ عمل اُس خلیفہ کے ساتھ تھا، جس کی صولت و سطوت نے مصر اور ایران کا تختہ الٹ دیا تھا۔ تاہم اسلامی حکومت میں کوئی دفعہ ۱۲۴ - الف نہ تھی۔

دوسرا دور شخصی جبر و استبداد (Autocracy) کا تھا، جس کی پہلی ضرب آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تقریر ہی پر پڑتی ہے۔ لیکن اس دور میں بھی زبانوں کی بیباکی اور دلوں کی بیخوفی اسی طرح سرگرم رہی، اور قید خانے کی تاریک کوٹھریاں، تازیانوں کی ضرب اور جلاد کی تیغ بھی انھیں نہ روک سکی۔ پیغمبرِ اسلام کے ساتھی (صحابۂ کرام) جب تک زندہ رہے، وقت کے جابر بادشاہوں کے ظلم کا اعلان کرتے رہے، اور برابر مطالبہ کرتے رہے کہ حکومت قوم کے مشورہ اور انتخاب سے ہونی چاہیے۔ جو لوگ اُن کے تربیت یافتہ تھے (تابعین) ان کا اعلان بھی بعینہٖ یہی رہا کہ "درست ہو جاؤ، یا مِٹ جاؤ"۔ امام محمد غزالی نے (جن کو یورپ کے مورخینِ فلسفہ بھی Algazel کے نام سے پہچانتے ہیں، اور اب میڈم کاریلی کے ناول Ardath کے دو کر باب نے انگریزی علمِ ادب کو بھی روشناس کر دیا ہے) صرف ان صحابہ اور تابعین کا ذکر کیا ہے جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانے تک موجود تھے، اور جنھوں نے حکمرانوں کے مظالم کا اعلان کر کے ہمیشہ منصفانہ اور نیابتی گورنمنٹ کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کی تعداد ۲۳ سے بھی زیادہ ہے۔

ہشام بن عبدالملک نے طاؤس یمانی کو بلایا۔ وہ آئے، مگر اس کا نام لے کر سلام کیا۔ "امیر المومنین" یعنی قوم کا سردار نہ کہا۔ جو مسلمان خلفاء کا لقب تھا۔ ہشام نے سبب پوچھا تو کہا: "قوم تیری حکومت سے راضی نہیں، اس لیے تجھے اُن کا امیر کہنا جھوٹ ہے"۔ ہشام نے کہا: "نصیحت کیجیے"۔ فرمایا: "خدا سے ڈر، کیونکہ تیرے ظلم سے زمین بھر گئی"۔

مالک بن دینار بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کرتے: "اِن ظالم بادشاہوں کو خدا نے اپنے بندوں کا چرواہا بنایا تھا، تاکہ اُن کی رکھوالی کریں۔ پر انھوں نے بکریوں کا گوشت کھا لیا۔ بالوں کا کپڑا اُبن کر پہن لیا اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں"۔

سلیمان بن عبدالملک جیسے ہیبتناک خلیفہ سے ابو حازم کہتے: "ان آباؤک قہروا الناس

بالسیف، واخذ الملک عنوۃ من غیر مشورۃ من المسلمین ولا رضا منہم" (تیرے باپ دادوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مقہور کیا، اور بلا قوم کی رائے اور انتخاب کے مالک بن بیٹھے)۔
سلیمان نے کہا: اب کیا کیا جائے؟ جواب دیا "جن کا حق ہے انھیں لوٹا دے"۔ کہا میرے لیے دعا کیجیے۔ فرمایا "خدایا! اگر سلیمان حق پر چلے، تو اُسے مہلت دے۔ لیکن اگر ظلم سے باز نہ آئے، تو پھر تو ہے اور اُس کی گردن"۔
سعید بن مسیّب بہت بڑے تابعی تھے۔ وہ علانیہ بر سرِ بازار حکّام کے ظلم و جور کا اعلان کرتے اور کہتے: "کتوں کا پیٹ بھرتے ہو، مگر انسانوں کو تم سے امان نہیں"۔
اس عہد کے بعد بھی مسلمان عالموں اور پیشواؤں کی حق گوئی کا یہی عالم رہا۔ منصور عباسی کے خوف و ہیبت سے گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ کانپا کرتے تھے۔ سفیان ثوری سے ایک بار اُس نے کہا: "مجھ سے اپنی کوئی حاجت بیان کیجیے"۔ انھوں نے جواب دیا: "اتق اللہ فقد ملائت الارض ظلماً وجوراً" (خدا سے ڈر۔ زمین ظلم و جور سے بھر گئی ہے)۔
جب مشہور عباسی خلیفہ، ہارون الرشید تخت نشین ہوا (جس نے فرانس کے شارلیمین کو ایک عجیب گھڑی بطور تحفہ کے بھیجی تھی، اور قیصر روم کو بقول گبن "اے کتّے کے بچے" کے لقب سے خط لکھا تھا) تو اس نے اپنی سفیان ثوری کو اپنے ہاتھ سے اشتیاقِ ملاقات کا خط لکھ کر بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں نے تخت نشینی کی خوشی میں بے شمار مال و دولت لوگوں میں تقسیم کی ہے۔ تم بھی مجھ سے آکر ملو۔ سفیان کوفہ کی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے اندر بیٹھے تھے کہ یہ خط پہنچا۔ لیکن انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "جس چیز کو ایک ظالم کے ہاتھ نے چھوا ہے، میں اسے چھونا نہیں چاہتا"۔ جب پڑھ کر سنایا گیا، تو اسی کی پشت پر جواب لکھوا دیا "خدا کے مغرور بندے ہارون کو جس کا ذوقِ ایمان سلب ہو چکا ہے، معلوم ہو۔ تو نے قوم کا مال بلا کسی حق کے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں لٹا دیا، اور اس کا حال لکھ کر اپنے گناہ پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی گواہ ٹھہرایا۔ پس ہم سب کل کو اللہ کے آگے اس کی گواہی دینگے۔ اے ہارون! تو نے انصاف و حق سے کنارہ کیا۔ تو نے پسند کیا کہ ظالم بنے اور ظالموں کی سرداری پائے۔ تیرے حاکم بندگانِ خدا

کو ظلم و جور سے پامال کر رہے ہیں اور تو تختِ شاہی پر عیش و عشرت کر رہا ہے"۔ ہارون نے جب یہ خط پڑھا، تو بے اختیار رونے لگا اور کہا: یہ خط ہمیشہ میرے ساتھ رہیگا۔
مسلمان عالموں اور اماموں پر موقوف نہیں، اس عہد کا ہر عام فرد بھی اس اعلان میں بالکل بخوف تھا۔ منصور عباسی ایک دن کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ آواز آئی کہ کوئی شخص دعا مانگ رہا ہے: "خدایا میں تیرے آگے فریاد کرتا ہوں۔ ظلم غالب آگیا ہے اور حق اور حقداروں کے درمیان روک بن گیا ہے"۔ منصور نے اُس شخص کو بلا کر پوچھا: وہ کون ہے جس کا ظلم روک بن گیا ہے کہا: "تیرا وجود اور تیری حکومت"
حجاج بن یوسف کا ظلم و ستم تاریخِ اسلام کا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ لیکن اس کی بے پناہ تلوار بھی مسلمانوں کی حق گوئی پر غالب نہ آسکی۔ حطیط جب گرفتار ہو کر آیا تو پوچھا: اب میرے لیے کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا "تو خدا کی زمین پر اُس کا سب سے بڑا دشمن ہے"۔ پوچھا۔ خلیفہ کے لیے کیا کہتے ہو؟ کہا "اس کا جُرم تجھ سے بھی زیادہ ہے تیرا ظلم تو اس کے بیشمار ظالموں میں سے صرف ایک ظلم ہے"
مامون الرشید کے عہد میں ایسے مسلمان موجود تھے جو پکار پکار کر بر سرِ دربار کہتے "یا ظالم! انا ظالم ان لم اقل لک یا ظالم!" (اے ظالم! میں ظالم ہوں اگر تجھے ظالم کہ کر نہ پکاروں!)

فتنۂ تاتار اور فتنۂ یورپ:

یہ تو تاریخِ اسلام کے ابتدائی اوراق ہیں، لیکن اس عہد کے بعد بھی ہر دور کا یہی حال رہا۔ مسلمانوں کے لیے موجودہ عہد کا عالمگیر فتنہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے ہی سیلاب میں ڈوب کر اُچھل چکے ہیں جس طرح آج یورپ اور علی الخصوص انگلستان کے ظہور اور تسلّط سے تمام ایشیا اور اسلامی ممالک کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ہے ٹھیک اسی طرح پندرھویں صدی مسیحی میں بھی تاتاریوں کے وحشیانہ تسلّط سے ظہور میں آیا تھا۔ یورپ کے فتنہ کا آخری نتیجہ عثمانی خلافت کی پامالی اور ایشیاء کوچک کا قتلِ عام ہے۔ تاتاری فتنہ کی آخری چینونا کی، عباسی خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتلِ عام تھا۔
تاتاری انسان نہیں تھے، درندے تھے۔ تاہم ہلاکو خان، منکو خان، اباقآن خان

جیسے سفاکوں کے زمانے میں بھی وہ مسلمان موجود رہے ہے، جن کی زبانیں اعلانِ حق میں ان کی تلواروں سے بھی زیادہ تیز تھیں۔ شیخ سعدی شیرازی نے (جن کی "گلستان" کا نام اس کورٹ نے بھی سنا ہوگا) ہلاکو خان کے منھ پر اُسے ظالم کہا۔ شمس الدین نیازی نے منکو خان کے دربار میں اس کی ہلاکت کی دعا مانگی۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ نے اباقا ان پر برسرِ دربار لعنت بھیجی۔ تاتاریوں کے پاس بے دریغ قتل کر دینے کا قانون تھا، تاہم "تورہ چنگیز خانی" (قوانینِ چنگیز خان) میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔ الف نہ تھی!

"حجاج" اور "ریڈنگ":

ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ (جن کی اطاعت ازروے شرع ہم پر واجب ہے) ایسا سلوک رہا ہے، تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی "ازروے قانون قائم شدہ" گورنمنٹ ہمارے لیے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے، جو "ازروے شریعتِ اسلام" واجب الاطاعت ہے؟ کیا انگلستان کی بادشاہت اور لارڈ ریڈنگ کی نیابت عبد الملک کی خلافت اور حجاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لیے زیادہ مقتدر ہو سکتی ہے؟ اگر ہم "اجنبی و غیر مسلم" اور "قومی و مسلم" کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظر انداز کر دیں، جب بھی ہم سے صرف یہی امید کی جا سکتی ہے کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لیے کہہ چکے ہیں، وہی "چمسفورڈ" اور "ریڈنگ" کی گورنمنٹوں کے لیے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا: اتق اللہ فقد ملأت الارض ظلما و جورا" (خدا سے ڈرو کیونکہ تمھارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے) یہی ہم آج بھی کہتے ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لیے ہمیں بتلایا گیا تھا، نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرف کے مقابلے میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے، تو انھیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے تسامح اور درگذر کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ

وہ اسلام کو برطانیہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتے!

اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلہ میں دو طرح کے طرزِ عمل کا حکم دیا ہے کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں! ایک ظلم اجنبی قبضہ و تسلّط کا ہے۔ ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے۔ پہلے کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لیے حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ تو نہ کیا جائے لیکن "امر بالمعروف" اور "اعلان حق" جس قدر بھی امکان میں ہو، ہر مسلمان کرتا رہے۔ پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑیگا۔ دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑینگی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنی چاہییں، اور دونوں کا نتیجہ کامیابی و فتحمندی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں۔ اجنبیوں کے مقابلے میں سرفروشی بھی کی، اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھلائی۔ پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی جنگی جدّ و جہد" کوئی مثال نہیں رکھتی۔ اسی طرح دوسری صورت میں اُن کی" شہری جدّ و جہد" بھی عدیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے، حالانکہ مقابلہ ان کا پہلی حالت سے ہے۔ ان کے لیے" جنگی جدّ و جہد" کا وقت آگیا تھا۔ لیکن انھوں نے" شہری جدّ و جہد" کو اختیار کیا۔ انھوں نے" نان وائیلنٹ" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کرلیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کرینگے۔ یعنی صرف وہی کرینگے، جو انھیں مسلمان حکومتوں کے ظلم کے مقابلے میں کرنا چاہیے۔ بلا شبہہ اس طرزِ عمل میں ہندوستان کی ایک خاص داخلی حالت کو بھی دخل ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کرسکتے ہیں؟ حد ہوگئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلہ میں وہ بات کر رہے ہیں، جو انھیں اپنوں کے مقابلے میں کرنی تھی!

انقلابِ حال!

میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر

مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہر حال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی درد انگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمانِ شہادت کی توقع کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا جائیگا!

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے، وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمران کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمران کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی، وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمران ظالم ہے! یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴۔ الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو!

میں اس درد انگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلابِ حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے، اور اُن کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں، جو اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرورش کر رہے ہیں!

یا آزادی یا موت:

لیکن انسانوں کی بدعملی سے کسی تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اُس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

اسی لیے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جان فروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔ اُن کا اسلامی فرض یہ ہے کہ

ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بیکار نہ گئیں مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر ملک کو غلامی سے نجات دلائینگے۔

مسئلہ خلافت و پنجاب :

(۱۰) میں یہاں گورنمنٹ کی ان ناانصافیوں کا افسانہ نہیں چھیڑونگا جو مسئلۂ "خلافت" اور مظالم "پنجاب" کا عالمگیر افسانہ ہیں۔ لیکن میں اقرار کرونگا کہ گزشتہ دو سال کے اندر کوئی صبح و شام مجھ پر ایسی نہیں گذری ہے، جس میں میں نے "خلافت" اور "پنجاب" کے لیے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ: "جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کر رہی ہو، اور مظالم پنجاب کے لیے کوئی تلافی اور شرمندگی نہ رکھتی ہو، ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی کے دل میں وفاداری نہیں ہو سکتی۔ گورنمنٹ کی جگہ وہ ایک فریق محارب کی حیثیت رکھتی ہے"۔

میں نے ۱۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء کو (جب میں رانچی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے نظر بند تھا) لارڈ چمسفورڈ کو ایک مفصل چٹھی لکھی تھی، اس میں واضح کر دیا تھا کہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں؟ میں نے لکھا تھا کہ اگر برٹش گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ممالک پر خلاف وعدہ متصرف ہو گئی، تو اسلامی قانون کی رو سے ہندستانی مسلمان ایک انتہائی کشمکش میں مبتلا ہو جائینگے۔ ان کے لیے صرف دو ہی راہیں رہ جائینگی۔ یا اسلام کا ساتھ دیں، یا برٹش گورنمنٹ کا وہ مجبور ہونگے کہ اسلام کا ساتھ دیں۔

بالآخر وہی ہوا۔ گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز نہ رہی۔ اُس وعدہ کا بھی ایفا ضروری نہ سمجھا گیا، جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲۔ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کے اعلان میں کیا تھا، اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہوا۔ جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ جنوری سنہ ۱۹۱۸ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا۔ شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے، لیکن طاقتور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں ہے!

اِس حالت نے مسلمانوں کے لیے آخری درجہ کی کشمکش پیدا کر دی ۔ اسلامی قانون کی رُو سے کم از کم بات جو اُن کے فرائض میں داخل تھی، یہ تھی کہ ایسی گورنمنٹ کی اعانت اور کوآپریشن سے ہاتھ کھینچ لیں ۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ۔ وہ اُس وقت تک اس پر قائم رہینگے جب تک انھیں اپنا مذہب اور مذہب کے اٹل احکام عزیز ہیں ۔

مسلمانوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اگر وہ حق و انصاف چاہتے ہیں تو اس کی راہ صرف ایک ہی ہے: سوراج کا حصول یعنی ایسی قومی گورنمنٹ کا حصول جو ہندوستانیوں کی ہو، ہندوستان میں ہو، اور ہندوستان کے لیے ہو ۔

اگر ظلم نہیں تو کیا عدل ہے ؟

(۱۱) غرض کہ اس بارے میں میرا اقرار بالکل صاف اور واضح ہے ۔ موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیورو کریسی ہے، وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کے لیے محض نفی ہے، وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے، وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتلِ عام جائز رکھتی ہے، وہ انسانوں کے لیے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں، وہ بیگناہ لڑکوں کو صرف اس لیے تازیانے کی ضرب سے بیہوش ہو جانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بُت کی طرح "یونین جیک" کو سلام نہیں کرتے ؟ وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی، وہ اپنے تمام وعدوں کے توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی، وہ سمرنا اور تھریس کو صریح نامنصفانہ طور پر یونانیوں کے حوالہ کر دیتی ہے، اور پھر تمام اسلامی آبادی کے قتل و غارت کا تماشا دیکھتی ہے ۔

انصاف کی پامالی میں اُس کی جراُت اَن تھک اور دلیری بالکل بے باک ہے اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اس کے مُنھ میں کوئی لگام نہیں ۔ سمرنا میں ۷۰ فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے، مگر وزیر اعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی کثرت کا اعلان کر دیتا ہے ۔ یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو خون اور آگ کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے لیکن

وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی فرضی داستان بیان کرتا رہتا ہے، اور خود انگلستان کے بھیجے ہوئے امریکن کمیشن کی رپورٹ پوشیدہ کردی جاتی ہے!

پھر نہ تو ان تمام مظالم وجرائم کے لیے اس کے پاس اعتراف ہے، نہ تلافی۔ بلکہ ملک کی جائز اور باامن جدّوجہد کو پامال کرنے کے لیے ہر طرح کا جبروتشدد شروع کردیا جاتا ہے۔ اور وہ سب کچھ کیا جاتا ہے، جو گزشتہ ایک سال کے اندر ہو چکا ہے۔ اور ۱۸ نومبر سے اس وقت تک ملک کے ہر حصّہ میں ہو رہا ہے۔ میں اگر ایسی گورنمنٹ کو "ظالم" اور "یا درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ" نہ کہوں تو کیا "عادل" اور "نہ تو درست ہو، نہ مٹو" کہوں؟

کیا صرف اس لیے کہ ظلم طاقتور ہے اور اس کے پاس جیل ہے، اس کا حقدار ہو جاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے۔ میں اٹلی کے نیک اور حریت پرست جوزف میزینی کی زبان میں کہونگا: "ہم صرف اس لیے کہ تمہارے ساتھ عارضی طاقت ہے، تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کر سکتے!"

"جرم کا قدیم اور ناقابلِ شمار ارتکاب":

(۱۲) میں نہایت متعجب ہوں کہ میرے خلاف صرف یہی دو نا تمام اور ناکافی تقریریں کیوں پیش کی گئی ہیں؟ کیا ان ہزاروں صفحات سے جو میرے قلم سے نکل چکے ہیں، اور اور ان بیشمار تقریروں سے جن کی صدائیں ہندستان کے ایک ایک گوشہ میں گونج چکی ہیں، صرف یہی سرمایہ گورنمنٹ بہم پہنچا سکی؟ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری کوئی تقریر گذشتہ دو سال کے اندر ایسی نہیں ہوئی ہے، جس میں یہ تمام باتیں میں نے بیان نہ کی ہوں۔

میں متصل بارہ سال سے اپنی قوم وملک کو آزادی وحق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں۔ میری ۱۸ برس کی عمر تھی، جب میں نے اس راہ میں تقریر وتحریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصّہ یعنی عہدِ شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کردیا۔ میں اسی کی خاطر چار سال تک نظر بند رہا، مگر نظر بندی میں بھی میری ہر صبح وشام اسی کی تعلیم وتبلیغ میں بسر ہوئی۔ "رانچی" کے در ودیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں، جہاں میں نے

نظر بندی کا زمانہ بسر کیا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے۔ میں صرف اسی ایک کام کے لیے جی سکتا ہوں: اِنَّ صَلَاتِي، وَنُسُكِي، وَمَحْيَايَ، وَمَمَاتِي، لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ!ؔ[۵]

آخری اسلامی تحریک

(۱۳) میں اس "جرم" سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں جب کہ میں ہندوستان کی اس آخری "اسلامی تحریک" کا داعی ہوں، جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹیکل مسلک میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آ رہے ہیں۔ یعنی اُن میں سے ہر فرد میرے اِس جرم میں شریک ہو گیا ہے۔ میں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک اردو جریدہ "الہلال" جاری کیا، جو اس تحریک کا آرگن تھا، اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے، بلکہ مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائیگی۔ مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی، اور بےخوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اسی سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریکِ خلافت و سوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے پہلے الہلال کی ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا، تو سنہ ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کر دیا۔

---

۵ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت (غرض سب کچھ) پروردگار کے لیے ہے (۶: ۱۶۲) م

میں تبلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" تمامتر "آزادی یا موت" کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلکِ بحث و نظر کی بنیاد ڈالی، اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارہ کرونگا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے ہیں، الہلال اس کام سے سنہ ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی نئی اور طاقتور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی، جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے پوری طرح فروغ پالیا۔

خلافت کانفرنس کلکتہ:

(۱۴) چار سال کے بعد پہلی جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو میں رہا کیا گیا۔ اس وقت سے گرفتاری کے لمحہ تک، میرا تمام وقت انہی مقاصد کی اشاعت و تبلیغ میں صرف ہوا ہے۔ ۲۸۔۲۹ فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا تھا، اور مسلمانوں نے مایوس ہو کر اپنا آخری اعلان کر دیا تھا:

> اگر برٹش گورنمنٹ نے مطالباتِ خلافت کی اب بھی سماعت نہ کی، تو مسلمان اپنے شرعی احکام کی رُو سے مجبور ہو جائینگے کہ تمام وفادارانہ تعلقات منقطع کریں۔

میں اس کانفرنس کا پریسیڈنٹ تھا۔

میں نے اس کے طولانی پریسیڈنشل ایڈریس میں وہ تمام امور بتفصیل بیان کر دیے تھے جو اس قدر ناقص شکل میں ان دو تقریروں کے اندر دکھلائے گئے ہیں۔

موالات اور فوجی ملازمت:

میں نے اسی ایڈریس میں اس اسلامی حکم کی بھی تشریح کر دی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ سے "ترکِ موالات" کریں، یعنی کوآپریشن اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ یہی "ترکِ موالات" ہے جو آگے چل کر

"نان کوآپریشن" کی شکل میں نمودار ہوا اور مہاتما گاندھی جی نے اس کی سربراہی کی۔

اِسی کانفرنس میں فوج کے متعلق وہ رزولیوشن منظور ہوا تھا، جس میں اسلامی قانون کے بموجب مسلمانوں کے لیے فوجی نوکری ناجائز بتلائی گئی تھی کیونکہ گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ملکوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ کراچی کا مقدمہ اسی رزولیوشن کی بنا پر چلایا گیا۔ میں بار بار اخبارات اور تقریروں میں اعلان کرچکا ہوں کہ یہ رزولیوشن سب سے پہلے میں نے ہی طیّار کیا تھا، اور میری ہی صدارت میں تین مرتبہ منظور ہوا۔ سب سے پہلے کلکتہ میں، پھر بریلی اور لاہور میں۔ پس اس "جرم" کی تعزیر کا بھی پہلا حقدار میں ہی ہوں۔

میں نے اس اڈریس کو مزید اضافہ کے بعد کتاب کی شکل میں بھی مرتّب کیا، جو انگریزی ترجمہ کے ساتھ بار بار شائع ہوچکا ہے اور گویا میرے "جرائم" کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔

میری زندگی سرتاسر ۱۲۴ ہے:

(الف) میں نے گزشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مہاتما گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا۔ کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں میں نے خلافت، پنجاب، سوراج، اور نان کوآپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں، اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔

دسمبر ۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا، اپریل سنہ ۲۱ء میں جمعیتہ العلماء کا بریلی میں جلسہ ہوا، گزشتہ اکتوبر میں یو۔ پی پراونشل خلافت کانفرنس، آگرہ میں منعقد ہوئی، نومبر میں آل انڈیا علماء کانفرنس کا لاہور میں اجلاس ہوا۔ ان تمام کانفرنسوں کا بھی میں ہی صدر تھا لیکن ان میں بھی تمام مقرّرین نے جو کچھ کہا، اور صدارتی تقریروں میں، میں نے جو خیالات ظاہر کیے، اُن سب میں وہ تمام باتیں موجود تھیں، جو ان دو تقریروں میں دکھلائی

گئی ہیں۔ بلکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ان سے بہت زیادہ قطعی و واضح خیالات ظاہر کیے گئے تھے!

اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴ ۔ الف کا جرم ہیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف پہلی اور پندرھویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقع اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑیگا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴ - الف کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔

نان وائلینس نان کوآپریشن:

(۱۶) ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وائلینس نان کوآپرشین" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خونریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے، لیکن ہمارا اعتماد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے، میں اسے فطرۃ الٰہی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدّ وجہد کے لیے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے متفق ہوں، اور ان دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وائلینس جدّ وجہد کے ذریعہ فتحمند ہوگا، اور اس کی فتحمندی اخلاقی و ایمانی طاقت کی فتحمندی کی ایک یادگار مثال ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو باامن جدّ وجہد کی تلقین کی اور اس کو کامیابی کی سب سے پہلی شرط قرار دیا۔ خود یہ تقریریں بھی اسی موضوع پر تھیں جیسا کہ پیش کردہ نقول سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ میں ان چند مسلمانوں میں سے ہوں جو بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انھوں نے نہایت مضبوطی کے ساتھ مسلمانوں کو باامن جدّ وجہد پر قائم

نہ رکھا ہوتا، تو نہیں معلوم، مسئلہ خلافت کی وجہ سے ان کا صبر آزما اضطراب کیسی خوفناک شکل اختیار کر لیتا؟ کم از کم ہندوستان کے ہر حصّہ میں ایک "مالیبار" کا منظر تو ضرور نظر آ جاتا۔

سی آئی، ڈی کے رپورٹرز:

(۱۷) اب جب کہ میں ان دو تقریروں کے تمام اُن حصّوں کا اقرار کر چکا ہوں، جن سے پراسیکیوشن استدلال کر سکتا ہے، تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر چند الفاظ ان کی پیش کردہ صورت کی نسبت بھی کہہ دوں۔

سی۔ آئی۔ ڈی کے گواہوں نے بیان کیا ہے کہ میری تقریروں کے نوٹس بھی لیے گئے اور مختصر نویسی کے ذریعہ بھی قلمبند کی گئیں۔ جو کاپی داخل کی گئی ہے (اگزہیبٹ اے اور سی) وہ مختصر نویس کی مرتب کی ہوئی ہے۔ لیکن یہ میری تقریروں کی ایک ایسی مسخ شدہ صورت ہے کہ اگر چند ناموں اور واقعات کی طرف اشارہ نہ ہوتا تو میرے لیے شناخت کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ بلاشبہ ایک چیز ہے جو دور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی ہے، لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا چیز ہے؟ محض بے جوڑ، بے تعلق، اور اکثر مقامات پر بے معنی جملے ہیں، جو بغیر کسی ربط اور سلسلہ کے صفحوں پر بکھیر دیے ہیں۔ گرامر اور محاورہ دونوں سے انھیں یکقلم انکار ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹر تقریر سمجھنے اور قلمبند کرنے سے عاجز تھا۔ اس لیے درمیان سے بہتوں کے جملے چھوڑتا جاتا ہے، اور تمام حروف ربط و تعلیل تو بالکل ہی حذف کر دیے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمام وہ الفاظ جن کی آواز یا اسپلنگ (املا) میں ذرا سا بھی تشابہ ہے، بالکل ہی بدل گئے ہیں، اور عبارت یا تو بے معنی ہو گئی ہے یا محرّف۔ مثلاً میں نے یکم جولائی کی تقریر میں مشہور فرنچ شاعر اور ادیب وکیٹر ہیوگو کا قول نقل کیا تھا:

آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو۔

مختصر نویس نے "ظلم" کی جگہ "دھرم" لکھ دیا ہے، جو صریح غلط اور بے موقعہ ہے۔ البتّہ اس کی آواز "ظلم" سے مشابہ ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر ہے:

اُنھوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برباد کیا ہے

حال آنکہ مصیبت کو برباد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ غالباً میں نے "برداشت کیا ہے" کہا ہوگا یعنی انھوں نے جیل کی مصیبت جھیل لی ہے۔ چونکہ دونوں لفظوں کی آواز ملتی جلتی ہے اور مختصر نویس خود فہم و امتیاز سے محروم ہے، "برداشت" کی جگہ "برباد" لکھ گیا۔

اُردو مختصر نویسی

اصل یہ ہے کہ اُردو مختصر نویسی کا قاعدہ اور مختصر نویس کی نا قابلیت، دونوں ان نقائص کے لیے ذمّہ دار ہیں۔

اُردو مختصر نویسی کا قاعدہ سنہ ۱۹۰۵ء میں کرسچین کالج لکھنؤ کے دو پروفیسروں نے ایجاد کیا، جن میں سے ایک کا نام مرزا محمد ہادی۔ بی۔ اے ہے۔ میں اس وقت لکھنؤ ہی میں تھا۔ اس لیے مجھے ذاتی طور پر اُس کے دیکھنے اور موجدوں سے گفتگو کرنے کا بارہا اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے موجدوں نے انگریزی علامات کو بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا ہے، لیکن وہ اردو حروف و املا کو پوری طرح محفوظ کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خود انھیں بھی اس نقص کا ایک حد تک اعتراف تھا۔ لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ مختصر نویس کی ذاتی قابلیت اور حافظہ و مناسبت سے اس کی تلافی ہو جائیگی۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تجربے سے ان کا خیال درست نہ نکلا۔

صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے ابتدائی تجربے کے لیے دو پولیس سب انسپکٹروں کو تعلیم دلائی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے آزمایشی طور پر جن پبلک تقریروں کو قلمبند کیا ہے بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ میری اور شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی تقریریں تھیں۔

ہم دونوں نے انجمن اسلامیہ ہردوئی کے سالانہ جلسے میں لکچر دیے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا شبلی نے فی منٹ ساٹھ لفظوں کی رفتار سے تقریر کی تھی، اور میری تقریر فی منٹ (۷۰) سے (۹۰) تک تھی، جیسا کہ خود مختصر نویسوں نے ظاہر کیا تھا۔ظاہر ہے کہ یہ کوئی تیز رفتار نہ تھی ۔ تاہم جب انھوں نے اپنا کام مرتّب کر کے دکھلایا تو بالکل ناقص اور غلط تھا ۔ اس کے بعد بھی مجھے بارہا اپنی تقریروں کے قلمبند کرانے کا اتفاق ہوا، لیکن ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ نکلا ۔ ابھی حال کی بات ہے کہ خلافت کانفرنس، آگرہ میں میرا زبانی پریزیڈنشل ایڈریس ایک مشّاق مختصر نویس سید غلام حسین نے قلمبند کیا جو عرصہ تک یو پی کے محکمۂ سی ۔ آئی ۔ ڈی میں کام کرنے کے بعد مستعفی ہوا ہے ۔ لیکن جب لانگ ہینڈ میں مرتّب کر کے مجھے دکھلایا گیا، تو اس کا کوئی حصّہ صحیح اور مکمل نہ تھا ۔

یہ تو اصل قاعدہ کا نقص ہے، لیکن جب اس پر مختصر نویس کی ناقابلیت کا بھی اضافہ ہو جائے، تو پھر کوئی خرابی ایسی نہیں ہے جس سے انسانی تقریر مسخ نہ کی جا سکے ۔ کلکتہ اور بنگال کی مخصوص حالت نے اس نقص کو اور زیادہ پُر مصیبت بنا دیا ہے ۔ یہاں کے دیسی اور یوروپین افسر خود اُردو زبان سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے ۔ حتیٰ کہ معمولی طور پر بول بھی نہیں سکتے ۔ انکے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی زبان سے کسی مختلف لہجہ میں آواز نکالے، اُردو کا اسکالر ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ پولیس اور عدالت ان رپورٹوں اور مختصر نویسوں کو بطور سند کے استعمال کر رہی ہے، جن بیچاروں کی استعداد پر ہمیشہ ہم لوگ تمسخر کیا کرتے ہیں ۔

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلکتہ کی پولیس اور عدالتوں میں ایک شخص بھی اردو زبان کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے ۔ اگر یہاں اس حقیقت کا کچھ بھی احساس ہوتا، تو صرف یہی بات بطور ایک عجیب واقعہ کے خیال کی جاتی کہ میری تقریروں کے لیے پولیس اور سی ۔ آئی ۔ ڈی کے غریب رپورٹروں کی شہادت لی جا رہی ہے! میں تسلیم کرتا ہوں کہ کم از کم یہ منظر ضرور میرے لیے تکلیف دہ ہے!

مشرقی لٹریچر اور سرکاری وسائلِ علم

یہ کہنا ضروری نہیں کہ میں اپنے ڈیفنس کی غرض سے ان شہادتوں کی بے اعتمادی ثابت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو پورا پورا اقرار کر چکا۔ مقصود صرف دو باتوں کا اظہار ہے:۔

اولاً، جو سرکاری مقدمات اُردو تقریر و تحریر کی بنا پر چلائے جاتے ہیں، اُن کے وسائلِ ثبوت کس درجہ ناکارہ اور ناقابلِ اعتماد ہیں؟

دنیا ہندوستان کی بیوروکریسی کی ناکامیابی اور ناموافقت۔ وہ ڈیڑھ سو برس تک حکومت کر کے بھی اس قابل نہیں ہوئی کہ ہندوستانی زبانوں کے متعلق صحیح اور مستند ذرائع سے معلومات حاصل کر سکتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء میں نظر بند کیا گیا، اور بہار گورنمنٹ کے حکّام اور پولیس افسر (جن کو اردو زبان سے بمقابلۂ بنگال زیادہ تعلّق ہے) تلاشی کے لیے آئے، تو انھوں نے میری تمام کتابوں کو بھی ایک خوفناک لٹریچر سمجھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ قبضہ میں کر لیا۔ یہ تمام کتابیں عربی اور فارسی زبان میں تھیں، اور تاریخ، فقہ اور فلسفہ کا معمولی مطبوعہ ذخیرہ تھا جو بازاروں میں فروخت ہوتا رہتا ہے۔ صرف ایک کتاب "مطالبِ عالیہ" نامی قلمی تھی جو سب سے زیادہ پُراسرار سمجھی گئی۔ لطف یہ ہے کہ اُن کی فہرست ڈپٹی کمشنر کی درخواست سے مجھے ہی مرتّب کرنی پڑی۔ کیونکہ تفتیشِ جرائم کے اس پورے کمیشن میں ایک شخص بھی اس قابل نہ تھا کہ کتابوں کے ٹائیٹل پیج کو صحت کے ساتھ پڑھ لیتا!

میں نے نظر بندی کے زمانے میں چار سال تک اپنی ڈاک کے لیے خود ہی سنسرشپ کے فرائض بھی انجام دیے ہیں، کیونکہ جو سرکاری افسر اس غرض سے مقرر کیا گیا تھا، وہ اس قدر قابل آدمی تھا کہ اُردو کے معمولی لکھے ہوئے خطوط بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ اکثر میری ڈاک صرف دستخط کر کے بھیج دیتا، اور شب کو آکر مجھ سے اس کا ترجمہ لکھوا لیتا۔

جب کہ نظر بندی میں، مَیں اپنی ڈاک کی خود ہی نگرانی کر رہا تھا، تو شملہ اور دہلی کے حکّام اپنی کارفرمائی پر نہایت نازاں تھے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنے ایک خطرناک

دشمن کو بالکل مجبور اور معطل کر دیا ہے!

اس وقت بھی میرے قلمی مسودات کلکتہ پولیس کے قبضہ میں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک جرم، تاریخ، تفسیر قرآن، اور لٹریچر ہے!

میں یہاں عربی دان اشخاص کی دلچسپی کے لیے ان کتابوں کے چند نام درج کر دیتا ہوں، جنھیں نہایت خوفناک سمجھ کر پولیس نے شملہ بھیجا تھا، اور عرصہ تک سر چارلس کلیولینڈ کے حکم سے میری نظر بندی کے دیگر معاملات کی طرح ان کی بھی تحقیقات ہوتی رہی۔

فتح القدیر شرح ہدایہ، طبقات الشافعیہ سبکی، ازالۃ الخفا، کتاب الام مدونۂ امام مالک، مطالب عالیہ امام رازی، شرح حکمۃ الاشراق۔ شرح مسلم الثبوت بحر العلوم۔ کتاب المستصفیٰ، کتاب اللمع۔

اصل یہ ہے کہ کسی جرم کے لیے جو لٹریچر سے تعلق رکھتا ہو، کوئی ایسی عدالت منصفانہ کارروائی نہیں کر سکتی جو ذاتی طور پر رائے قائم نہ کر سکے۔ یعنی خود اس زبان سے واقف نہ ہو۔ لیکن موجودہ بیوروکریسی علاوہ بیوروکریسی ہونے کے غیر ملکی بھی ہے۔ اس لیے ہر گوشہ میں اجنبی اقتدار کی غلامی کے نتائج کام کر رہے ہیں۔ عدالتیں ہندوستان کی ہیں اور ہندوستانیوں کے لیے ہیں، لیکن ان کی زبان جزیرۂ برطانیہ کی ہے، اور اکثر جالنوں میں ایسے افراد سے مرکب ہیں جو ملکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے"!

یہی وجہ ہے کہ اب ہم اس گورنمنٹ سے اور کچھ نہیں چاہتے۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو، وہ اپنے سے بہتر اور حقدار کے لیے اپنی جگہ خالی کر دے۔

موجودہ حالت قدرتی ہے:

(۱۸) میں جیسا کہ ابتدا میں لکھ چکا ہوں، خاتمۂ سخن میں بھی دہراؤں گا۔ آج گورنمنٹ جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہی ہے، وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کے لیے خاص طور پر اسے ملامت کی جائے۔ قومی بیداری کے مقابلے میں مقاومت اور جبر و تشدد تمام قابض حکومتوں کے لیے طبیعت ثانیہ (سکنڈ نیچر) کا حکم رکھتا ہے، اور ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے

کہ ہماری خاطر انسانی طبیعت بدل دی جائیگی۔

یہ قدرتی کمزوری افراد اور جماعت، دونوں میں یکساں طور پر نمود رکھتی ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنے قبضہ میں آئی ہوئی چیز صرف اس لیے لوٹا دینگے کہ وہ اس کے حقدار نہیں؟ پھر ایک پورے برِاعظم کے لیے ایسی امید کیونکر کی جاسکتی ہے؟ طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلّل ہے۔ وہ تو خود بھی طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے، اور جب وہ نمودار ہو جاتی ہے تو پھر ناواجب سے ناواجب مطالبہ کے آگے بھی جھک جاتی ہے۔ پس کشمکش اور انتظار ناگزیر ہے، اور ایک ایسی قدرتی بات ہے جس کو بالکل دنیا کے معمولی اور روزمرّہ کاموں کی طرح بلا کسی تعجب و شکایت کے انجام پانا چاہیے۔

میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ تاریخ نے اس بارے میں انسانی ظلم و تعدّی کے جو ہیبتناک مناظر دکھلائے ہیں، ان کے مقابلے میں موجودہ جبر و تشدّد کسی طرح بھی زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ البتّہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کمی اس لیے ہے کہ ابھی ملک کا جذبۂ قربانی ناتمام ہے، یا اس لیے ہے کہ ظلم زیادہ مکمّل نہیں؟ مستقبل اس کو واضح کر دیگا۔

جس طرح اس کشمکش کا آغاز ہمیشہ یکساں طور پر ہوا ہے، اسی طرح خاتمہ بھی ایک ہی طرح ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہمارا جذبۂ آزادی و حق طلبی سچّا اور اٹل ثابت ہوا، تو یہی گورنمنٹ جو آج ہمیں مجرم ٹھہرا رہی ہے، کل کو فتحمند محبّ الوطنوں کی طرح ہمارے استقبال پر مجبور ہوگی!

بغاوت:

(۱۹) مجھ پر سڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے، لیکن مجھے "بغاوت" کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا "بغاوت" آزادی کی اس جدّوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ ہم اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابلِ احترام محبّ الوطنی بھی ہے، جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آیرلینڈ کے السٹر لیڈر باغی تھے،

لیکن آج ڈی ویلورا اور گریفتھ کے لیے برطانیہ عظمیٰ کونسا لقب تجویز کرتی ہے ؟
اسی آئرلینڈ کے پارنل (Parnel) نے ایک مرتبہ کہا تھا : "ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدّس جنگ تسلیم کیا گیا ہے"

قانون "قضا بالحق"

(۲۰) میں مسلمان ہوں، اور میرے یقین کے لیے وہ بس کرتا ہے، جو میری کتاب شریعت نے بتلایا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ جس طرح مادّہ اور اجسام میں انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) کا قانون جاری ہے، اور فطرت صرف اسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح و اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد و اعمال میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے۔ آخری فتح اسی عمل کی ہوتی ہے جو حق اور سچ ہو، اور اسی لیے باقی و قائم رہنے کا حقدار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہوگا، تو آخر کی جیت انصاف ہی کے حصّہ میں آئیگی۔ وَاَمَّا مَا یَنفَعُ النَّاسَ فَیَمکُثُ فِی الاَرضِ کَذٰلِکَ یَضرِبُ اللّٰہُ الاَمثَالَ ۔ (۱۳ : ۱۸) (زمین پر وہی چیز باقی رہیگی جو نافع ہو۔ غیر نافع چھانٹ دی جائیگی)

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں سچائی کا نام "حق" ہے جس کے معنی ہی جم جانے اور ثابت ہو جانے کے ہیں۔ اور جھوٹ اور بدی کا نام باطل ہے، جس کے معنی ہی مٹ جانے کے ہیں : اِنَّ البَاطِلَ کَانَ زَھُوقًا (باطل تو صرف اسی لیے ہے کہ مٹ جائے !)

پس آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ انصاف باقی رہیگا۔ ناانصافی مٹا دی جائیگی۔ ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں !

البتّہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھ کر بارش کا انتظار کیا جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں۔ افسوس ان آنکھوں پر، جو نشانیوں سے انکار کریں۔

میں نے اپنی تقریروں میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں، کہا تھا : "آزادی کا بیج کبھی

بار آور نہیں ہوسکتا جب تک جبر و تشدد کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو"
لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کردی ہے!
میں نے انہی میں کہا تھا: "مبلغین خلافت کی گرفتاریوں پر کیوں مغموم ہو؟ اگر تم فی الحقیقت انصاف اور آزادی کے طلبگار ہو، تو جیل جانے کے لیے طیار ہو جاؤ۔ علی پور کا جیل اس طرح بھر جائے کہ اس کی کوٹھریوں میں چوروں کے لیے جگہ باقی نہ رہے"!
فی الحقیقت جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ پریسیڈنسی اور سنٹرل جیل کا بڑا حصہ قیدیوں سے خالی کردیا گیا۔ پھر بھی جگہ کافی نہ ہوئی۔ نیا جیل بنایا گیا۔ وہ بھی آناً فاناً بھر گیا جگہ نکالنے کے لیے سیکڑوں قیدی رہا کر دیے گئے، لیکن ان سے دُگنے نئے آگئے۔ اب مزید نئے جیل بنائے جا رہے ہیں!

سرکاری وکیل، پولیس، اور مجسٹریٹ

(۲۱) قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کردں، اپنے اُن ہموطن بھائیوں کی نسبت بھی ایک دو جملے لکھونگا، جو اس مقدمہ میں میرے خلاف کام کر رہے ہیں۔ میں نے اوپر کہیں کہا ہے کہ "سی۔ آئی۔ ڈی کا کام جہالت اور شرارت دونوں سے مرکب ہوتا ہے" یہ میں نے اس ذاتی علم کی بنا پر کہا جو بیشمار مقدمات کی نسبت مجھے حاصل ہے۔ تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ہے، انھوں نے اس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاہر کیا گیا ہے، کوئی بات بھی غلط نہیں کہی ہے۔

میری تقریریں جو پیش کی گئی ہیں، ان میں بھی کوئی بات شرارت کی نہیں پاتا جس قدر ان کے اغلاط اور نقائص ہیں، غالباً صرف ناقابلیت کا نتیجہ ہیں۔ ایک دو مقامات ایسے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاسکتا ہے کہ دانستہ خراب کرکے دکھلائے ہیں مثلاً جہاں جہاں میں نے لوگوں کو با امن رہنے، ہڑتال نہ کرنے، ہر طرح کے مظاہرات سے مجتنب رہنے کی تلقین کی ہے، وہ بقیہ حصوں سے بھی زیادہ الجھے ہوئے اور بے ربط

ہیں ۔متعدد مقامات پر "امن" کو "ایمان" کر دیا ہے جو وہاں بالکل بے ربط ہے : تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی قاعدہ کے ناقص اور ذاتی ناقابلیت کی وجہ سے ہے ، نہ کہ شرارت سے ۔

البتہ میرا یقین ہے کہ انھوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے ، اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے ، وہ ضرور معصیت ہے ۔ لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی کمزوری بھی معلوم ہے ۔ وہ محض چند روپیوں کی نوکری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں ، اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں ۔ پس میرے دل میں ان کے لیے کوئی رنج اور ملامت نہیں ہے ۔ میں اس کام کے لیے انھیں معاف کرتا ہوں ، اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی معاف کر دے ۔

پبلک پراسیکوٹر بھی جو ان مقدمات میں کام کر رہا ہے ، میرا ایک ہموطن بھائی ہے ۔ اس کی ضمیر یارا ے میرے سامنے نہیں ہے ۔ محض مزدوری ہے ، جو اس کام کے لیے وہ گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے ۔ پس اس کی طرف سے بھی میرے دل میں کوئی رنج نہیں ۔ البتہ میں ان سب کے لیے وہی دعا مانگوں گا جو پیغمبر اسلام نے ایک موقعہ پر مانگی تھی : "خدایا ! ان پر راہ کھول دے ، کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں ؟"

فاقض ما انت قاض !

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے ، بلا تامل مجھے دے دے ۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا ۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے ، کسی ایک پرزے سے نہیں ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلیگی ، پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے ۔

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیلِ صداقت گارڈ بینو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں ، جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا :

زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے ، بلا تامل دے دو ۔ میں یقین دلاتا

ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سُن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔

خاتمہ:

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لونگا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصّہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے۔ تمھارے حصّہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اِس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے، اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو۔ اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہیگا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کُھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھیگا، اور اُسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا! وَالحمدُ لِلّٰہ اولاً و آخراً۔

۱۱ - جنوری سنہ ۱۹۲۲ء

پریسیڈنسی جیل۔ علی پور۔ کلکتہ

احمد

ہندستان میں موسیقی

قلعۂ احمد نگر

۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

بچے ربڑ کے رنگین غباروں سے بہت خوش ہوتے ہیں ۔ مجھے بھی بچپنے میں ان کا بڑا شوق تھا ۔ والد مرحوم کے مُریدوں میں ایک شخص غلام رحمٰن تھا، جو انگریزی ٹوپیوں کا کاروبار کرتا تھا ۔ وہ مجھے یہ غبارے لا دیا کرتا ؛ اور میں اس سے بہت ہل گیا تھا ۔ یہ غبارے ویسے ہی ہوتے ہیں، جیسے مُنھ سے پھونکنے کے ہوتے ہیں، لیکن ان میں گیس بھر دی جاتی ہے اور وہ انھیں اوپر کی طرف اڑائے رکھتی ہے ۔ ایک مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ، اسے چھید کے دیکھنا چاہیے، اندر سے کیا نکلتا ہے ۔ سہسرام کی ایک مغلانی امانی نام ہمارے گھر میں سلائی کا کام کرتی تھی میں نے امانی کے سلائی بکس سے ایک سوئی نکالی اور غبارے میں چبھو دی ۔ اس واقعے کو سینتالیس برس گذر چکے ہیں ۔ لیکن اس وقت بھی خیال کرتا ہوں تو اس سنسنی کا اثر صاف صاف دماغ میں محسوس ہونے لگتا ہے جو اچانک گیس کے نکلنے اور ایک لمبی سی سی کی سی آواز پیدا ہونے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی ۔ گیس باہر نکلنے کے لیے کچھ ایسی بیتاب تھی کہ سوئی کا ذرا سا چھید پاتے ہی فوراً فوارہ کی طرح مضطربانہ اچھلی اور دو تین سکنڈ بھی ابھی نہیں گزرے تھے کہ غبارہ خالی ہو کے سکڑ گیا اور زمین پر گر گیا ۔

یقین کیجیے آج کل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینے کا بھی محسوس کر رہا ہوں ۔ غبارے کی طرح اس میں بھی کوئی پُرجوش عنصر ہے جو بھر گیا ہے اور نکلنے کے لیے بیتاب ہے ۔ اگر

کوئی ہاتھ ایک سوئی اُٹھا کر چبھو دے، تو مجھے یقین ہے اس میں سے بھی ویسا ہی جوش اُمنڈ کر اچھلیگا، جیسا غبارہ سے مضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا:

شد آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بیا نگ چنگ بگوئیم آں حکایتہا
کہ از نہفتنِ آں دیگِ سینہ می زد جوش

کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سوئی چبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا، جو آیا اور گزر گیا اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہ نہ سکی۔

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

میرے ساتھ لاسلکی کا ایک سفری (پورٹیبل) سٹ سفر میں رہا کرتا تھا۔ جب بمبئی میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا، تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا۔ لیکن جب سامان قلعہ کے اندر لایا گیا، تو اس میں سٹ نہیں تھا معلوم ہوا کہ باہر روک لیا گیا ہے جیلر سے پوچھا تو اس نے کہا، کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے روکا گیا ہے اور اب گورنمنٹ سے اس بارے میں دریافت کیا جائیگا۔ بہر حال جب یہاں اخباروں کا آنا روک دیا گیا تھا، تو ظاہر ہے کہ لاسلکی کے سٹ کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی! تین ہفتہ کے بعد اخبار کی روک تو اُٹھ گئی مگر سٹ پھر بھی نہیں دیا گیا! وہ چیتہ خان کے آفس میں مقفل پڑا رہا۔ اب میں نے چیتہ خان کو دے دیا ہے کہ وہ اپنے بنگلہ میں لگا کر کام میں لائے، کیونکہ اب وہ جس بنگلہ میں منتقل ہوا ہے، اُس میں لاسلکی سٹ نہیں ہے۔

لیکن آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فرو کش ہے؛ اس کے

پاس لاسلکی کانسٹ ہے، کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آ نکلتی ہے۔ کل رات بہت صاف آنے لگی تھی، غالباً بی۔ بی سی کا پروگرام تھا اور کوئی وائلین Violin بجانے والا اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ نَے ایسی تھی جیسی کہ Mendelssohn کے مشہور قطعہ "[illegible]" (سوانگس وِد آوٹ ورڈز) کی سننے میں آتی تھی!

حدیثِ عشق کو از حرف و صوت مستغنی ست
بنالۂ دَف و نے در خروش و ولولہ بود

ناگہاں ایک مغنیۂ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اٹھی اور اس نے ساز کے زیر و بم کے ساتھ مل کر وہ عالم پیدا کر دیا، جس کی طرف خواجۂ شیراز نے اشارہ کیا ہے:

چہ راہ می زند ایں مطربِ مقام شناس
کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے، لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا، تو بدستور انقباضِ خاطر واپس آ گیا تھا:

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد
یا کہ خود زخم مرا لذتِ آزار نماند

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے۔ اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلبہ کو پڑھانے میں مشغول تھا، تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا، جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی، اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف خان کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مصوّر نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے۔ سیف خان عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان

کی موسیقی کے علم وعمل کا ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدابخش کے ہاتھ لگا تھا، آصفجاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کتب خانہ کا تھا، اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینسن راس آگئے، جو اس زمانہ میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے، اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کمسن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور وخوض سے مطالعہ کر رہا ہے متعجب ہوئے، اور مجھ سے فارسی میں پوچھا: یہ کس مصنف کی کتاب ہے؟" میں نے فارسی میں جواب دیا کہ سیف خان کی کتاب ہے اور فنِ موسیقی میں ہے۔ انھوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ "ہندوستان کا فنِ موسیقی بہت مشکل فن ہے، کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟" میں نے کہا: جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ میں بھی اسے پڑھونگا تو سمجھ لونگا۔" انھوں نے ہنس کر کہا "تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھ سکتے ہو تو مجھے اس صفحہ کا مطلب سمجھاؤ۔" انھوں نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا تھا، اس میں مبادیات کی بعض تقسیموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے، مگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہوگیا، اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا، بغور مطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکونگا۔

میں نے کتاب لے لی اور گھر آکر اسے اوّل سے آخر تک پڑھ لیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہرِ فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اس بات کی خوگر ہوگئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی، اس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہوگیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی، تو طبیعت کو سخت اُلجھن ہوئی۔ اور خیال ہوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے۔ لیکن مدد لی جائے، تو کس سے لی جائے؟ خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچہ سے رسم وراہ رکھنے والوں کے ساتھ

لنا آسان نہ تھا ۔ آخر خیال میتا خان کی طرف گیا ۔ اس پیشہ کا بھی ایک آدمی تھا جس کی ہمارے یہاں گزر تھی ۔

اس میتا خان کا حال بھی قابلِ ذکر ہے ۔ یہ سونی پت ، ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا اور پیشہ کا خاندانی گویا تھا ۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی اور دہلی اور جے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی ۔ کلکتہ میں طوائفوں کی معلمی کیا کرتا تھا ۔

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے !

یہ والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا ۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے ، لیکن اصلاح و توجہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے ، فرماتے : "بغیر بیعت کے آتے رہو ، دیکھو ، خدا کو کیا منظور ہے !" اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بخود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے ۔ چنانچہ میتا خان کو بھی یہی جواب ملا ۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے تو پہلے کچھ دیر دیوان خانہ میں بیٹھتے ، پھر اندر جاتے ۔ خاص خاص مرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے آجاتے اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رخصت ہو جاتے ۔ میتا خان بھی ہر جمعہ وعظ کے بعد حاضر ہوتا ، اور دور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا ۔ کبھی والد مرحوم کی نظر پڑ جاتی ، تو پوچھ لیتے ۔ میتا خان ، کیا حال ہے ؟ ، عرض کرتا : "حضور کی نظرِ کرم کا امیدوار ہوں ۔" فرماتے : "ہاں اپنے دل کی لگن میں لگے رہو ۔" وہ بے اختیار ہو کر قدموں پر گر جاتا ، اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے انھیں تر کر دیتا ۔ ہا ، ذوق نے کیا خوب کہا ہے :

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

کبھی عرض کرتا : "رات کے دربار میں حاضری کا حکم ہو جائے" ، یعنی رات کی مجلسِ خاص میں جو مریدوں کی تعلیم و ارشاد کے لیے ہفتہ میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی ۔ اِسے

والد مرحوم ٹال جاتے ۔ مگر ان کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا ؛ فرماتے: اچھی بات ہے ۔ دیکھو، ساری باتیں اپنے وقت پر موزہینگی " وہ جان باختۂ امید و بیم اتنے ہی میں نہال ہوجاتا اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا ۔ خواجہ حافظ ان معاملات کو کیا ڈھب کرکہہ گئے ہیں :

بحاجبِ درِ خلوت سرائے خاص بگو

"فلاں ز گوشہ نشینانِ خاکِ درگہِ ماست"

لیکن بالآخر اس کا عجز و نیاز اور صدقِ طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا ۔ والد مرحوم نے اُسے مرید کرلیا تھا اور حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی ۔ اُسے بھی کچھ ایسی توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی معلمی سے تائب ہوگیا اور ایک بنگالی زمیندار کی ملازمت پر قناعت کرلی ۔ والد مرحوم کو میں نے ایک مرتبہ یہ کہتے سنا تھا کہ میتنا خان کا حال دیکھتا ہوں تو پیر چنگی کی حکایت یاد آجاتی ہے یعنی مولانا روم والے پیر چنگی کی :

پیر چنگی کے بود مردِ خدا

حبّذا اے سرِّ پنہاں حبّذا!

بہرحال میرا خیال اسی میتنا خان کی طرف گیا اور اس سے اس معاملہ کا ذکر کیا پہلے تو اُسے کچھ حیرانی سی ہوئی ، لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آگیا ، تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادہ کی نظرِ توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے ۔ لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے ، تو کیسے لائی جائے ؟ گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا ، سارنگا کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا ، اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا ۔ بہرحال اس مشکل کا ایک حل نکال لیا گیا اور ایک رازدار مل گیا جس کے مکان میں نشست و برخاست کا انتظام ہوگیا ۔ پہلے ہفتہ میں تین دن مقرر کیے تھے ، پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا ۔ میتنا خان پہلے سے وہاں موجود رہتا اور دو تین گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا :

عشق می ورزم و امید کہ این فنِ شریف
چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نشود

میتا خان نے تعلیم کا ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے استادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے، وہی اس نے یہاں بھی چلایا۔ لیکن میں نے اسے روک دیا اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مرتّب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا، اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن اس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھائیے، پوری طرح اٹھائیے؛ اور جہاں تک راہ ملے، بڑھتے ہی جائیے۔ کوئی کام بھی ہو، لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا، اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے تو انھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا، تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے؛ پارسائی کی راہ ملی، تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے ناقصوں اور خامکاروں کی طرح نہ جائیے۔ رسم و راہ رکھیے، تو راہ کے کاملوں سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا، تو جہاں تک راہ ملی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی؛ بین سے انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں۔ لیکن زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہو گیا، اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں پہلے درد تھا

اس عالم رنگ و بو میں ایک روش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے، تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اُٹھ نہیں سکتی:

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

اور ایک بھونرے کی ہوئی کہ ہر پھول پر بیٹھے، بو باس لی، اور اڑ گئے:

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے

چنانچہ زندگی کے چمنستان ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا۔ کچھ دیر کے لیے رُک کر بو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے، کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا تھا، تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشہ میں رچ گیا تھا، دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا، اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی!
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے! اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر، جس کے بےحس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

سینہ گرم نداری، مطلب صحبت عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر

میں آپ سے ایک بات کہوں! میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا، اور جسم و دل کی ساری

بیماریوں کا علاج ہے:

رُوے نکو معالجۂ عمر کو تہ ست
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

مجھے اگر آپ اپنی زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے، آپ کا مقصد پورا ہو جائیگا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانہ میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے، تو وہ ریڈیوسٹ کا فقدان ہے:

لذّتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خُلد میں بھی یہ بَلا یاد آئی

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویّت کے بعض ناقابلِ فراموش احوال پیش آئے، جو اگرچہ خود گذر گئے، لیکن ہمیشہ کے لیے دامنِ زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرے کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاند کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی، تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا، میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستارے کر تاج چلا جاتا، اور اس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی رات پھیلنے لگتی، ستار وں پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گذر چکے ہیں:

گدائے میکدہ اَم لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک، وحکم بر ستارہ کنم

رات کا سنّاٹا، ستاروں کی چھاؤں ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔

بیچ میں چاندنی سے دُھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بَل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں، اور راوی پر ستاروں کی اَن گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اُٹھتے، اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے:

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی، گویا کان لگا کر خاموشی سے سُن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی بُرجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس عالم میں بارہا میں نے بُرجیوں سے باتیں کی ہیں، اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے، تو (۳) کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے:

تو مپندار کہ ایں قصہ ز خود میگویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ جانے اور کئی ماہ تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ سب سے پہلے آپ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے قلمی کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کلیاتِ صائب کا ایک نسخہ خریدا تھا، اور مجھے یہ کہہ کر دکھایا تھا کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کچھ شوق ہے؟

ایں سخن را چہ جواب ست، تو ہم میدانی!

اسی قیام کے دوران میں مرزا محمد ہادی مرحوم سے شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی

دخل رکھتے تھے اور چونکہ علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے، اس لیے علمی طریقے پر اُسے سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے، مجھے ان سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔ افسوس وہ بھی چل بسے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس، تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اس زمانے میں کرسچین کالج کے سامنے پانچ روپیہ ماہوار کرایہ کا ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہی ان کی دنیا تھی۔ علمِ ہیئت کے شوق نے نجاری کے مشغلہ سے آشنا کر دیا تھا۔ جب کالج سے آتے تو مکان کی چھت پر لکڑی کے دوائر قطر اور نصف اور ثلث بنانے میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح اپنی رصد بندیوں کا ساماں کرتے۔ چھت کی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ جبت لگا کر اوپر پہنچتے اور پھر ساری ساری رات ستاروں کی ہم نشینی میں بسر کر دیتے:-

کہ با جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم

کئی برس کے بعد پھر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا، تو انھیں ایک دوسرے ہی عالم میں پایا۔ ایک رشتہ دار کے انتقال سے کاپی کی کچھ جائداد ورثہ میں مل گئی تھی، اور اب جوانی کی محرومیوں کا بڑھاپے کی ذوق اندوزیوں سے کفّارہ کرنا چاہتے تھے۔

وقتِ عزیز رفت بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت

یہ گرمجوشیاں چونکہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں ابھری تھیں۔ اس لیے شاہدانِ نغمہ پردازانہ سے صحبتیں گرم رہتی تھیں، اور بعض استادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ اگرچہ میرا قیام بہت مختصر رہا۔ لیکن جتنے دن رہا، موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اسی زمانے کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے معارف النغمات کی ترتیب میں مدد دی جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

بچپنے میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے۔ صدرِ اوّل کے زمانے سے

نے کر جس کا حال ہم کتاب الاغانی اور عقد الفرید وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں، آج تک حجازیوں کا ذوق موسیقی غیر متغیر رہا۔ یہ ذوق اُن کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ اذان کی صدا اُن تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا۔ آج کل کا حال معلوم نہیں، لیکن اس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارے پر ایک مؤذن متعین ہوتا تھا۔ اور ان سب کے اوپر شیخ المؤذنین ہوتا۔ اس زمانے میں شیخ المؤذنین شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر میں ان کی ترحیم کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں، اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی، جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ جب عراق اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا، تو موجودہ عربی موسیقی کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدما کی بہت سی مصطلحات جو ہمیں کتاب الاغانی اور خوارزمی وغیرہ میں ملتی ہیں، اب کوئی نہیں جانتا۔ تعبیر و تقسیم کے اسماء و رموز تغیر پا بدل گئے ہیں اور عربی کی جن مصطلحات نے ایران پہنچ کر فارسی کا جامہ پہن لیا تھا، وہ اب پھر عربی میں واپس آکر معرب ہو گئی ہیں، البتہ فن کی پرانی بنیادیں ابھی تک متزلزل نہیں ہوئیں۔ وہی بارہ راگنیاں اب بھی اصل و بنیاد کا کام دے رہی ہیں جو یونانی موسیقی کی تقلید میں وضع ہوئی تھیں۔ آسمان کے بارہ بُرجوں کی طرف اب بھی انھیں اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے، جس طرح قدماء نے کیا تھا۔ آلات موسیقی میں اگرچہ بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں لیکن عُود کے پردے ابھی تک خاموش نہیں ہوئے ہیں، اور ان کے زخموں سے وہ نوائیں اب بھی سنی جا سکتی ہیں جو کبھی ہارون رشید

---

۵ صبح کی اذان سے پہلے مختلف کلمات ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں، اسے ترحیم کہتے ہیں۔ کم سے کم چار سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی، کیونکہ ملا علی قاری اور صاحب الباعث نے اسے بھی بدع و محدثات میں سے شمار کیا تھا۔

کی شبستانِ طرب میں اسحاق موصلی اور ابراہیم بن مہدی کے مضراب سے اٹھا کرتی تھیں:

ایں مطرب از کجاست کہ سازِ "عراق" ساخت
واہنگ بازگشت ز راہِ "حجاز" کرد

"عراق" اور "حجاز" دو راگنیوں کے نام ہیں۔ اور "راہ" یعنی سُر

مطرب نگاہ دار ہمیں "رہ" کہ میزنی

اس زمانے میں شیخ احمد سلامہ حجازی کا جوق مصر میں بہت مشہور اور نامور تھا۔ "جوق" وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے ہم نے یہاں منڈلی کے لیے "طائفہ" کا لفظ اختیار کیا تھا پھر اس کی جمع "طوائف" ہوئی اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ نے مفرد معنی پیدا کر لیے، یعنی زنِ رقاصہ و مغنیہ کے معنی میں بولا جانے لگا۔ شیخ سلاّمہ کا جوق قاہرہ کے اوپرا ہاؤس میں اکثر اپنا کمال دکھایا کرتا تھا، اور شہر کی کوئی بزمِ طرب بغیر اس کے بارونق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے بارہا اس کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عربی موسیقی آج کل جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے، وہ اس کا پورا ماہر تھا۔ ایک دوست کے ذریعہ اس سے شناسائی پیدا کی تھی، اور موجودہ عربی موسیقی پر مذاکرات کیے تھے۔

اس زمانے میں مصر کی ایک مشہور عالمہ؟ طاہرہ نامی باشندۂ طنطا تھی۔ "عالمہ" مصر میں مغنیّہ کو کہتے ہیں یعنی موسیقی کا علم جاننے والی! ہمارے علمائے کرام کو اس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ کی زبانوں میں یہی لفظ (ALMA) ہو گیا ہے۔ شیخ سلامہ بھی اس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلائے جان تھی، مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سُنے دیکھے، اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

جس زمانے کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں، اس سے کئی سال بعد مصر میں ام کلثوم کی شہرت

ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اس کے بیسیوں ریکارڈ سنے ہیں۔ اور قاہرہ انگورہ، طرابلس الغرب، فلسطین اور سنگاپور کے ریڈیو اسٹیشن آج کل بھی اس کی نواؤں سے گونجتے رہتے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے، وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس کے مشہور انشادات میں سے ایک نشید علیہ بنت المہدی کا مشہور تشبیب ہے:

وَحبّ، فان الحُبّ دَاعیۃ الحُبّ
وَکم من بعید الدّار مستوجب القُرب

البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتہً سادہ اور دِقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندستان نے اس معاملہ کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حُسنِ تقسیم اور دقتِ ترتیب یہاں کی ہر فنی شاخ کی عام خصوصیت رہی ہے لیکن جہاں تک نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یورپ کا موجودہ فنِ موسیقی جس کی بنیاد نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کے باکمالوں نے رکھی تھی، منتہائے کمال تک پہنچا دیا گیا ہے اور گو ذوقِ سماع کے اختلاف سے ہمارے کان اس کی پوری قدر شناسی نہ کر سکیں، لیکن دماغ اُس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیاء و معانی کے تمام مرکب مزاجوں کی طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا ہے اور سارا معاملہ مفرد اصوات و الحان کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ان مفرد اجزاء کی ترکیب کا تسویہ اور تناسب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائیگا موسیقی کی گہرائیاں اتنی ہی بڑھتی جائینگی۔ اس اعتبار سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ کا فنِ موسیقی فکرِ انسانی کی دِقّت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے اور جرمنی کے باکمالانِ فن نے تو اس باب میں بڑی ہی سحر کاری کی ہے حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مؤلف الحان کے اجزاء کو

وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزاء کو حسنِ ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے:

تو حِنا بستی و من معنیِ رنگیں بستم

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں، وہی موسیقی میں الحان و ایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے، لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا، اس نے اپنی رُوحِ معنی کے لیے نواؤں کا بھیس تیار کر لیا ؎

وَالاُذنُ تَعشَقُ قَبلَ العَینِ اَحیَانا!

یہ کیا بات ہے کہ بعض اَلحان درد و الم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں، بعض کے سننے سے مسرت و انبساط کے جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں! بعض کی لَے ایسی ہوتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو کہ زندگی اور زندگی کے سارے ہنگامے ہیچ ہیں۔ بعض کی لَے ایسی محسوس ہوتی ہے، جیسے اشارہ کر رہی ہو کہ:

یاران! صلائے عام ست، گرمی کنید کالے

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں ابھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام کا زمزمہ، کبھی شیلے (SHELLEY) کی ماتم سرائیاں ہوتیں، کبھی ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) کی حقائق سرائیاں:

دریں میدانِ پُر نیرنگ حیراں ست دانائی

کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی

یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندستان کے تمام علوم و فنون میں دلچسپی لی، لیکن ہندستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام عقائد پر نظر ڈالی ہے اور ایک باب فی کتبھم فی سائر العلوم پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ

؎ بعض اوقات آنکھوں سے پہلے کان محبت کرنے لگتے ہیں۔ (م)

(Sachau) نے الآثار الباقیہ کے مقدمہ میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے، جس میں اُس نے اپنی تمام مصنفات کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن اس میں بھی اِس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی، حال آنکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان کے نائک سلطان محمود اور سلطان مسعود کے درباروں میں اپنے کمالاتِ فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنین کے گلی کوچوں میں بجائے جارہے تھے۔ غالباً اس تغافل کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ علومِ عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اُس کی بہت کم مہلت دی کہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ کرتے؛ اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندستان کے ذوقِ سماع سے اس درجہ مختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بمشکل آشنا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندستان کے ڈراموں سے بھی عرب مصنف یک قلم ناآشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فنِ عروض کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے، لیکن ناٹک کا کوئی ذکر نہیں کرتا، حال آنکہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

خود یونان کے فنونِ ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ہی تغافل برتا؛ یونان کی شاعری اور ڈراموں کی انھیں بہت کم خبر تھی۔ ہومر اور سوفاکلیس وغیرہما کے نام انھیں ارسطو کے مقالات اور افلاطون کی جمہوریت سے معلوم ہو گئے تھے، لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ کر سکے۔ ابنِ رُشد نے "کامیڈی" اور "ٹریجڈی" کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی ڈرامہ کی حقیقت سے اس کا دماغ کس درجہ آشنا تھا۔ وہ کامیڈی کو ہجو اور ٹریجڈی کو مدح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ یونانی فنِ بلاغت سے ائمۂ بلاغتِ عرب کہاں تک متاثر ہوئے تھے، بظاہر انھوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ارسطو کے مقالات خطابت اور شاعری پر عربی میں منتقل ہو گئے تھے اور ابن رُشد نے اپنی شرح میں انھیں بھی شامل کیا، لیکن عربی ائمۂ فن نہ تو اس کی روح سمجھ سکے اور نہ بلاغتِ عربی کی سرگرانیوں نے

اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تمامتر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ہے، اور عربی دماغ ان سے آشنا نہ تھا۔ آپ نے ابنِ قدامہ کی نقدالشعر کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ چوتھی صدی کے بغداد کے علمی حلقہ میں اس کا نشوونما ہوا تھا، اور وہ نسلاً رومی تھا۔

چند سال ہوئے اسکوریال (اسپین) کے کتب خانہ میں ایک کتاب کا سراغ ملا، جس کی لوح پر نقدالنثر درج تھا، مگر مصنّف کا نام مٹا ہوا تھا۔ بہت غور کرنے سے ابوجعفر ابنِ قدامہ سے ملتے جلتے حروف دکھائی دینے لگے۔ جب اس نام کی کتاب دنیا کے کتب خانوں کی فہرستوں میں ڈھونڈی گئی، تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا نسخہ اس کا موجود نہیں۔ اسکوریال کے کتب خانہ میں زیادہ تر وہی کتابیں ہیں جو سترھویں صدی میں سلطانِ مراکش کے دو جہازوں کی لوٹ سے اسپین کے ہاتھ آئی تھی۔ چونکہ اس زمانے میں اسلامی ذخیروں کو تباہ کرنے کی مسیحی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں اِس لیے انھیں ضائع نہیں کیا گیا اور اسکوریال کی خانقاہ میں رکھ دی گئیں۔ یقیناً یہ نسخہ بھی اُسی لوٹ میں آگیا ہوگا۔ پچھلے دنوں جامعۂ مصریہ کے اِدارہ نے اس کا عکس حاصل کیا، اور ڈاکٹر منصور اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصحیح و ترتیب کے بعد چھپ کر شائع ہوگیا۔ دونوں نے اس پر الگ الگ مقدمے بھی لکھے ہیں۔ بظاہر اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسالہ بھی "نقدالشعر" کے مصنف ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ رسالہ کے اسلوبِ بیان میں منطقی طریقِ بحث و تحلیل صاف نمایاں ہے، جو آگے چل کر فنِ بلاغت پر بالکل چھا گیا۔ لیکن اصول فن خالص عربی ہیں اور امثال و نظائر میں بھی باہر کے اثرات کی کوئی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ بلاغت کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے یونان اور ہندستان کے بعض اقوال جاحظ کے حوالہ سے نقل کر دیے ہیں، اور وہ سب نے نقل کیے ہیں۔

لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا۔ وہ اس کے فنِ موسیقی سے برت نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ خود عربوں کا فنِ موسیقی کچھ نہ تھا، اور جتنی کچھ عارت بھی

انھوں نے اٹھائی تھی، اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا:

نوائے باربد ماندست و دستاں

چنانچہ کافی تصریحات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فنِ موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی بُرجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک برج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی۔ یونان اور روم کے آلات میں قانون اور ارغنون (آرگن) عام طور پر رائج ہو گئے تھے۔ ابونصر فارابی نے قانون پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ اخوان الصفا کے مصنفوں کو بھی موسیقی سے اعتنا کرنا پڑا۔

سندھ کے نو آباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے جو ان اطراف میں رائج ہوگی، ضرور آشنا ہوئے ہونگے؛ لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا، اُن سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بآسانی نکال لے جا سکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے، بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندستانی موسیقی کے علم و ذوق سے وہ تغافل برتتے۔ چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو جیسے مجتہدِ فن کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ ساز گری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندستانیوں کی آوازمیں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ مثنوی قران السعدین میں خود کہتے ہیں:

زمزمۂ "سازگری" در عراق
کردہ بگلبانگ عراق اتفاق

قول، ترانہ، سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گوّیے کی زبان پر ہیں، حال آنکہ یہ سب اسی عہد کی اختراعات ہیں، کلاسیکل موسیقی ان سے آشنا نہ تھی۔

غالباً مسلمان بادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اس کی سرپرستی شروع کردی تھی۔ ملتان، اجودھن، گور، اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت وقبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہرِ کمال پیش کرتے تھے، جہاں تک سلاطینِ ہند کا تعلق ہے خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدردانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں، لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بحیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا، وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان تھا۔ چنانچہ اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا اور دھرپد کی جگہ اس سے اہلِ فن اعتنا کرنے لگے۔ اسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں کا اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا شوق و ذوق نمایاں ہوتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم وعمل کا تختگاہ بن گئی تھی، اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی اسے حاصل ہو جاتی۔ ابراہیم عادل شاہ اور بقول ظہوری کے اس اقلیم گاہ کا جگت گرو تھا، اور اس کے شوقِ موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد وسماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے:۔

مروّت کردہ شبہا بر تو سیرِ بام و در لازم
نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

مالوا، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال وذوق کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے

چنانچہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام تر انہی کی سرپرستی میں نشو نما پائی۔ مالوا کے بازِ بہادر کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی؛ آج تک مالوا کے گھروں سے اس کے دُہروں کی نوائیں سنی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدر شناسیوں سے اس فن کو جو عروج ملا، اس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابو الفضل نے ان تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے، جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہو گئے تھے اور ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں جا بجا ایسے اشارے کیے ہیں، جن سے اس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی حسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضہ یہی تھا کہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس ہو۔ چنانچہ شاعری، مصوری اور موسیقی، تینوں کا دلدادہ اور اعلیٰ درجے کا کمال شناس تھا۔ اس کے دربار میں جس درجہ کے شاعر، مصور اور گوئیے جمع ہو گئے تھے، پھر ہندستان کی تاریخ میں جمع ہونے والے نہ تھے۔ اس کے دربار کے ایک مصور نے الیزبتھ کے سفیر کو اپنا کمال دکھا کر حیران کر دیا تھا۔ اُس کے شاعرانہ ذوق کے لیے اس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے:

از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابرست

اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنونِ دانشمندی میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیلِ علم اور تکمیلِ تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ امرا اور شرفا کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح تمام فنونِ مدارس کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا، اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ملک کے ہر حصے سے باکمالانِ فن کی مانگ آتی تھی، اور دہلی، آگرہ، لاہور اور احمد آباد کے گوئیے بڑی بڑی تنخواہوں پر امراء اور شرفاء کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو نوجوان تکمیلِ علم کے لیے بڑے شہروں میں آتے وہ یہاں کے عالموں اور مدرسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالانِ موسیقی کو بھی ڈھونڈتے اور پھر ان کے حلقۂ تعلیم میں زانوے تحصیل تہ کرتے۔ دکن

میں احمد نگر، بیجاپور، اور برہان پور کے اہلِ فن مشہور تھے؛ دوآبہ میں دہلی اور آگرہ کے؛ اور پنجاب میں لاہور، سیالکوٹ اور جھنگ کے۔

اس عہد میں ایران اور توران سے جو افاضل و اشراف آتے، وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و مناسبت کی ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے اور چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مقام شناس بن جاتے تھے۔ محمد قاسم فرشتہ صاحب تاریخ کا باپ مازندران سے آکر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت مازندران کی تھی۔ لیکن اسے ہندوستانی موسیقی سے اس قدر شغف ہوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی، یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ علاء الملک تونی جو جلوسِ شاہجہانی کے ساتویں سال ہندستان آیا اور فاضل خان کے خطاب سے مخاطب ہوا، اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں عہدۂ وزارت پر فائز ہوا، ہندستانی موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ اس سے استفاضہ کرتے تھے۔

اسی عہد کے کتنے ہی مقدّس علماء ہیں جن کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچاتے رہے، لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ مُلّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا عالم و ماہر تھا، اکبر نے اسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا لیتا ہے!" مُلّا عبدالقادر بدایونی جیسا متشرع اور متصلب شخص بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اور فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اس کی سفارش کرتے ہوئے اس مشاقی کا ذکر کر دے۔ علّامہ سعد اللہ شاہجہانی جن کی فضیلتِ علمی اور ثقاہتِ طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ رائے دے سکتے تھے؛ ان کے استاد مُلّا عبدالسلام لاہوری تھے۔ ان کے حلقۂ درس کی عالمگیریوں نے سمرقند اور بخارا تک کو مسخّر کر لیا تھا۔ اور جب شاہجہان نے شہزادوں کی تعلیم کے لیے تمام علمائے مملکت پر نظر ڈالی تھی، تو نظرِ انتخاب نے انہی کی سفارش کی تھی۔ لیکن ان کے ذوقِ موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ہدایہ اور بزدوی کے مقامات حل

کیا کرتے تھے۔ اسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ معالی خان، جو مُلّا طاہر پٹنی محدثِ گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے۔ ان کے حالات میں صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ ملّا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانشمند خان کہ سرآمد علمائے عصر تھا اور شاہجہان کے دربار میں اس کا مباحثہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے، ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہو گیا کہ وقت کے باکمالانِ فن کو اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ حکیم برنیر فرانسادی صاحبِ سفرنامۂ ہند اسی دانشمند خان کی سرکار میں ملازم تھا اور غالباً انسی کی صحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکمائے فرنگ کا اسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔

شیخ علاء الدین جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گزرے ہیں اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بکثرت گائی جاتی ہے:

ندانم آں گلِ رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغِ ہر چمنے گفتگوے او دارد
نشاطِ بادہ پرستاں بمنتہیٰ برسید
ہنوز ساقیِ ما بادہ در سُبو دارد

ان کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلاتِ موسیقی کے غیر معمولی مشاق تھے۔

شیخ جمالی صاحبِ سیر العارفین اور ان کے لڑکے شیخ گدائی، دونوں کا فنِ موسیقی میں توغل معلوم ہے۔ دَورِ آخر میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد فنِ موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرضِ اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصور کرتے۔

شیخ عبدالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے۔ سلوک و تصوف میں ان کی کتاب سنابل مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی

میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں اُن سے گرم ہوتی تھیں۔
بیرم خان موسیقی ہند کا بڑا قدر شناس تھا۔ اور اس کے لڑکے عبدالرحیم خانخاناں کی قدر شناسیاں تو اس درجہ تک پہنچ گئی تھیں، اکبر اور جہانگیر کی شاہانہ فیاضیاں بھی اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثرِ رحیمی کے خاتمہ میں جہاں ان علماء و شعرا کا ذکر کیا ہے، جو خان خاناں کی سرکار سے وابستہ تھے، وہاں موسیقی کے باکمالوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ ان میں ایرانی اور ہندوستانی، ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔
شاہنواز خان صفوی کے حالات میں صاحبِ مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ "شیفتۂ موسیقی بود و خوانندہ ہا و سازندہ ہا کہ پیشِ خود جمع کردہ بود، نظیر نداشتند" قریب قریب یہی الفاظ ہونگے۔ حافظہ سے لکھ رہا ہوں اور کتاب دیکھے ہوئے سالہا سال گذر گئے۔ زین خان کوکہ کا علومِ درسیّہ میں شغف معلوم ہے۔ پنجاب کی صوبداری کے زمانے میں بھی اس نے درس و تدریسِ علوم کا مشغلہ بالالتزام جاری رکھا تھا، لیکن اُس کے حالات میں بھی سب لکھتے ہیں کہ "بکبت و راگ شغفے داشت، و سازہا بکمالِ حسن و خوبی مینواخت"۔ اُس کا لڑکا مغل خان بھی اِس باب میں اپنے باپ کا جانشین تھا۔ خانِ کلاں میر محمد جو شمس الدین آتکہ کا بھائی تھا، موسیقیِ ہند کے علم و مہارت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ مرزا غازی خان بن جانی بیگ حاکمِ سندھ و قندھار کی نسبت سب لکھتے ہیں کہ نغمہ پردازی، طنبور نوازی اور تمام سازوں کے بجانے میں بے نظیر تھا۔ ملّا رشید یزدجردی نے اسی کی مدح میں یہ رُباعی لکھی تھی:

گر نغمہ سازت بسکوں می آید — رمزے ست بگو ہمت کہ چوں می آید
از بسکہ بگردِ زخمات می گردد — پیچیدہ ز طنبور بروں می آید

خانِ زماں میر خلیل نے جو یمین الدولہ آصف خان کا داماد تھا، اس فن میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی، کہ لوگ اپنے اختلافات اُس کے آگے فیصلہ کے لیے پیش کرتے بسرسن بائی جو شہزادہ مراد بخش کی محبوبہ تھی، خیال گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، مگر خود شہزادہ کی فن دانی کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ اس کی شاگردی پر ناز کرتی تھی اور زیب النسا

نے جب مراد کو قید کیا تو سرس بانی بھی تیار ہو گئی کہ اس کے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارا کرے۔ چنانچہ مراد کے ساتھ قلعہ گوالیار میں عرصہ تک محبوس رہی۔

مرزا عیسیٰ خان ترخان جس نے جانی بیگ کی وفات کے بعد سندھ میں بڑی شورش برپا کی تھی، نغمہ سنجی اور ساز نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

اب اس وقت حافظ کی گرہیں کھلنے لگی ہیں، تو بیشمار واقعات سامنے آرہے ہیں۔ شہزادہ خرم کی ماں، مان متی جو راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی، جب جہانگیر کے محل میں آئی، تو اس کے گانے کا محل میں شہرہ ہوا۔ جہانگیر چونکہ خود ماہر فن تھا، اس لیے اس نے امتحان لیا اور جب دیکھا کہ امتحان میں پوری اتری تو بہت خوش ہوا، اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اس کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے انھیں تیار کرے۔ خود خرم یعنی شاہجہان کے ذوق و مناسبت فن کا یہ حال تھا کہ تان سین کا جانشین لال خاں اس کا نام لے کر کان پکڑتا تھا۔ دھرپد میں شاہجہان کے رسوخ ذوق کا مورخوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نظام الملک آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کو موسیقی کے شوق نے سنسکرت زبان کی تحصیل کا شوق دلایا، تاکہ کلاسیکل موسیقی کی قدیم کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر سکے۔ اس کے حالات میں صاحب شہادت نامہ لکھتے ہیں کہ زبان سنسکرت سے واقف اور موسیقی اور سنگیت میں ماہر تھا۔

اس عہد میں ایک ایک امیر کی فیاضیاں ترقی فن کے لیے شاہانہ فیاضیوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتی کا پوتا اسلام خان جب جہانگیر کے عہد میں بنگال کا صوبیدار ہوا، تو اس کی سرکار میں اسی ہزار روپیہ ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں کہ اس کے دسترخوان پر ایک ہزار لنگریاں٥ کمال تکلف و اہتمام سے دونوں وقت چنی جاتی تھیں، مگر خود اس کا یہ حال تھا کہ جوار کی

---

٥ "لنگری" لکڑی کی روغن کی ہوئی سینی کو کہتے ہیں، جو لکڑی کے طشت کی طرح بہت بڑی ہوتی تھی، اور ایک گوسفند بریان اس میں رکھا جا سکتا تھا۔

روٹی اور ساٹھی کا خشکہ ساگ کے ساتھ کھاتا اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتا یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عمر بھر جامۂ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کرتا پہنتا رہا اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی طاقیہ[۱] اوڑھتا۔

اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشّف سے اگرچہ فنونِ لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی، مگر یہ جو کچھ ہوا صرف دربارِ شاہی تک محدود تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے ملک کے ہر گوشہ میں جو نہریں رواں کر دی تھیں، وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رُخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہو جاتیں۔ بلاشبہہ عالمگیری عہد میں شاہی سرکار کے کارخانے بند ہو گئے تھے، لیکن ملک کے ہزاروں لاکھوں گھروں کے کارخانے کون بند کر سکتا تھا! میں نے اس مکتوب کی ابتدا میں فارسی کتاب راگ درپن کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب فقیر اللہ سیف خان نے مرتب کی تھی جو اسی عالمگیری عہد کا ایک امیر اور ناصر علی سرہندی کا ممدوح تھا۔ شیر خان لودھی صاحب مرآۃ الخیال بھی اسی عہد میں تھا جس نے ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی، دونوں میں دستگاہ پیدا کی اور پھر دونوں پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ تذکرہ مراۃ الخیال میں بھی ایک فصل موسیقی پر لکھی ہے اور اپنے ذوقِ فن کا ذکر کیا ہے۔ موسیقی پر اس کی کتاب میری نظر سے گزر چکی ہے۔ اس کا ایک خوشخط نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس سلسلے میں خود اورنگ زیب کی زندگی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو "زین آبادی" کے نام سے مشہور ہوئی اور اس کے نغمہ و حسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانہ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحب مآثر الامرا نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر لکھا ہے:

---

[۱] طاقیہ، ہلکی ٹوپی کو کہتے ہیں جو گھر میں سر پر رکھ لیتے۔ آج کل بھی عرب میں اس ٹوپی کو طاقیہ ہی کہتے ہیں۔

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا، لیکن ایک زمانہ میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ:

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی۔ ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا، اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سایے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو شہزادے کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا، نہ اس کی خالہ کا، بے باکانہ اچھلی، اور ایک شاخِ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اس نے ملامت کی، تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادے پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادے کا کام تمام کر دیا، اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا:

با بلند عشوہ گر سروِ نازِ من
کوتاہ کرد قصۂ زہدِ دراز من

صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ "بکمالِ ابرام و سماجت زین آبادی را از خالۂ محترمہ خود گرفت۔ باآں ہمہ زہدِ خشک و تقشفِ بحت، شیفتہ و دلدادۂ او شد۔ قدح شراب بدستِ خود پُر کردہ می داد۔ گویند روزے زین آبادی ہم قدحِ بادہ پُر کردہ بدست

شہزادہ داد تکلیف شرب نمود"۔ یعنی بڑی منت و الحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہد خشک اور خالص تفقّہ کے جس کے لیے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگالے۔ دیکھیے، عرفی کا ایک شعر کیا موقعہ سے یاد آ گیا ہے، اور کیا چسپاں ہوا ہے:

ساقی تو ئی و سادہ دلی بیں کہ شیخ شہر
باور نمی کند کہ ملک مَے گسار شد

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو!

مے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو خمار باقیست

لیکن اس عیار کو رحم نہ آیا:

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی میاموز آں دو چشم نا مسلماں را

ناچار شہزادہ نے ارادہ کیا کہ پیالہ منھ سے لگالے۔ گویا وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا[۵] کی پوری روداد پیش آ گئی:

عشقش خبر ز عالم مدہوشی آورد
اہل صلاح را بقدح نوشی آورد

لیکن جونہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ ہو گیا ہے،

---

۵ اس نے اس کا ارادہ کیا، اور اس نے اس کا (یوسف، ۱۲ - ۲۴) م

فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا" اور کہا۔ "غرض امتحانِ عشق بود، نہ کہ تلخ کامیِ شما":

اے جورِ دیگرست کہ آزارِ عاشقاں
چنداں نمی کند کہ بہ آزار خو کنند!

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہاں تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ دارا شکوہ نے اس حکایت کو اپنی سعایت وغمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجّہ دلاتا۔ "ببینید، ایں مزوّرِ ریائی چہ صلاح وتقویٰ ساختہ است؟" ہاں، فیضی نے کیا خوب کہا ہے:

چہ دست مے بری اے تیغ عشق اگر داد ست
بہ زبانِ ملامت گر زلیخا را!

نہیں معلوم اس قضیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا، لیکن قضاوقدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا، یعنی عین عروجِ شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے:

خود رفتہ ایم در کنجِ مزارے گرفتہ ایم
تا بارِ دوشِ کس نشود استخوانِ ما

آپ نے عاقل خان رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہو گا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستارِ خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا، لیکن اُسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اس بات پر دالبستگانِ دولت کو تعجب ہوا کہ سوگواری کی حالت میں سیر و تفریح اور شکار کا کیا موقع تھا! جب اورنگ زیب شکار کے لیے محل سے نکلا، تو عاقل خان نے کہ میر عسکر تھا، تنہائی کا موقع نکال کر عرض کیا، اس غم واندوہ کی حالت میں شکار کے لیے نکلنا کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی ہو گا، جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔" اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالہ ہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اس پر عاقل خان کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکل گیا:

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت!

اورنگ زیب پر رقت کا عالم طاری ہو گیا۔ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ عاقل خان نے کہا: اس شخص کا ہے، جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خان کا ہے۔ بہت تعریف کی اور اس دن سے اس کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی۔ اس حکایت میں جس "پرستارِ خاص" کی موت کا ذکر آیا ہے، اس سے مقصود بھی "زین آبادی" ہے۔

صاحب مآثر الامرا نے خان زمان کے حال میں لکھا ہے کہ فن موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا، اور کاروبارِ منصب کے انہماک کے ساتھ راگ و رنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگانِ خوش آواز اور مغنّیاتِ عشوہ طراز اس کی سرکار میں ہمیشہ جمع رہتی تھیں۔ انہی میں "زین آبادی" بھی تھی، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کی مدخولہ تھی۔

خود اورنگ زیب بھی موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا، کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اس نے بھی اس کی تحصیل کی ہوگی۔ البتہ آگے چل کر اس کی طبیعت کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کی، اس لیے اس کے اشتغال و ذوق سے کنارہ کش ہو گیا، اور سلطنت پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے یہ کارخانہ ہی بند کر دیا۔ گوّیوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا، تو اس نے کہا: "اس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اٹھ سکے۔" لیکن اورنگ زیب کے سارے منصوبوں کی طرح سلطنت کا یہ پرہیزی مزاج بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا، اور اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ جس طرح انگلستان میں پیوریٹن (PURITAN) عہد کی خشک مزاجیاں اعادۂ حال کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھیں، اسی طرح یہاں بھی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا مزاج پھر لوٹ آیا۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد کی تر دماغیاں دراصل اسی عالمگیری خشک مزاجیوں کا ردِّ عمل تھا۔ سید عبدالجلیل محدّث

بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی کی تبریک میں جو مثنوی لکھی ہے، اس سے اس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے قدمائے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے، جس کی نسبت ان کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کر کے رام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکارِ قمرغہ کے سر و سامان میں داخل ہوئی اور اس کے طائفے باکمالانِ فن کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص نے مرأۃ المصطلحات میں اس طریقِ شکار کی بعض دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکارِ قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا، تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیے جاتے تھے، اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص و سرود کی محویت انھیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکارِ قمرغہ کا قصد کیا، اور اسی رقص و سرود کا جال بچھایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے تو نورجہان کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا:

همه آهوان صحرا سر خود نهاده بر کف
به امید آں که روزے بشکار خواهی آمد

یہ شعر سن کر جہانگیر کی غیرتِ مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اٹھائے؛ دل گرفتہ واپس آ گیا۔

یہ خیال کہ جانور گانے سے متاثر ہوتے ہیں، دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ توراۃ میں ہے کہ حضرت داؤد کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدمائے فن نے تو اسے ایک مسلّمہ حقیقت مان کر اپنے بیشمار عملیات کی بنیادیں اسی عقیدہ پر استوار کی تھیں۔ سانپ، گھوڑے اور اونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حدی کی لے اگر رُک جاتی ہے، تو محمل کی تیز رفتاری

بھی رک جاتی ہے:

حدی را تیز تر میخواں چوں محمل را گراں بینی

البیرونی نے کتاب الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا، اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو، تو اُسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے وہ صید کو جس طرف لے جانا چاہے، صرف اپنے راگ کے زور سے لگائے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے، جانوروں کی اس محویت و تسخیر کو عوام تعویذ اور گنڈے کا اثر سمجھتے ہیں۔ حال آنکہ یہ محض گانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں جہاں جزیرۂ سرندیپ کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے، یہاں بندر بہت ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مسافر ان کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں پڑھنے لگے، تو بندر اس کے مطیع ہو جائینگے اور اسے کچھ نقصان نہیں پہنچیگا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہو گی۔ یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہو گا کہ اشعار کی لَے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہو گی۔ پہلی تصریح غالباً اس باب میں ہے جو فی ذکر علوم لھم کاسرۃ الاجنحۃ علیٰ آفق الجھل کے عنوان سے ہے، اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملیگی جو فی معارف شتیٰ من بلادھم وانھارھم کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کا علم الحیوان اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا۔ اور تاثرات کے شاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں سرے سے سماعت کا حاسّہ ہی نہیں ہے۔

والہ داغستانی صاحب ریاض الشعرا، قزلباش خان اُمید، میر معز فطرت موسوی مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری، یہ سب تازہ ولایت ایرانی تھے، لیکن ہندوستان کی صحبتوں سے آشنا ہوتے ہی انھوں نے محسوس کیا کہ موسیقیِ ہند سے واقفیت پیدا کیے بغیر

اپنی دانش و شایستگی کی مسند نہیں سنبھال سکتے، اس لیے اس کی تحصیل ناگزیر ہے قزلباش خاں اُمید کی مجالس طرب کا حال قاضی محمد (صادق خان) اختر نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس فن میں کس درجہ دستگاہ اسے حاصل ہو گئی تھی۔ شیخ علی حزیں ایرانی موسیقی سے پوری طرح باخبر تھے، لیکن ہندوستان میں انھوں نے ہندوستانی موسیقی کی بھی تحصیل کی۔ پٹنہ کے قیام کے زمانے میں ان کا یہ دستور تھا کہ ہفتہ کے دو دن موسیقی کی صحبت کے لیے مخصوص کر دیے تھے؛ شہر کے باکمال حاضر ہوتے اور فن کی باریکیوں کے نمونے پیش کرتے۔

اودھ کی نوابی کے دَور میں تفضل حسین خاں علّامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی؛ شوستری صاحبِ تحفۃ العالم کلکتہ میں ان سے ملا تھا جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام علومِ عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی درجۂ اجتہاد رکھتے ہیں؛ اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا، ان کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں۔ ایک ماہر فن سازندہ صرف اس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خوابگاہ میں خواب آور گت چھیڑ دیا کرے۔

لکھنؤ کے علماء فرنگی محل میں بحرالعلوم کی نسبت ان کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فن موسیقی میں ان کا رسوخ عام طور پر مسلم تھا۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے زمانے میں جو اشتغال تحسینِ فکر اور تہذیبِ طبع کا باعث ہوتا ہے، وہی دَورِ تنزل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسنِ استعمال اور اعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے، اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی اور رصد عیبی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلسِ سماع و نشاط سے ان کی تھکن مٹاتا اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے ڈھکیل ڈھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں، دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ جب دیوان کی مہمات سے تھک جاتا، تو موسیقی کے باکمالوں

کو باریاب کرنا ہی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا
تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقع دیتا۔ موسیقی کا شوق دونوں کو
تھا، مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں

سارت مشرّقۃ و سرت مغرّبا ۔۔۔ شتّان بین مشرق و مغرب[1]

اس بات کی عام طور سے شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے،
اور موسیقی محرّماتِ شرعیہ میں داخل ہے، حال آنکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں
کہ فقہا نے سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدّد کیا؛ اور یہ تشدّد بھی بابِ قضا سے
تھا، نہ کہ بابِ تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع ہے؛ ہر چیز جو سوءِ استعمال سے
کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جا سکتی ہے؛ لیکن اس سے تشریع کا حکمِ اصلی
اپنی جگہ سے نہیں ہل جا سکتا؛ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ
مِنَ الرِّزْقِ[2]؛ لیکن یہ بحث یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا، یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی
جا رہی ہے وہ دوسرا ہے:

مومن! آ کیشِ محبّت میں کہ سب کچھ ہے روا
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ!

دیکھیے، بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر
لگائے، تو معلوم ہوا کہ فلسکیپ کے چھتّیس صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہر حال اب قلم روکتا ہوں۔

حرفِ نا منظورِ دل، یک حرف ہم بیش ست و بس
معنیِ دلخواہ گر صد نسخہ باشد، ہم کم ست

---

[1] میں نے بلادِ مشرق کی سیر کی اور مغرب میں بھی بہت گھوما، مشرق اور مغرب میں بہت فرق
ہے (م)

[2] کہو خدا نے اپنے بندوں کے لیے جو زینت کی چیزیں پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی عمدہ
چیزیں، انھیں کس نے حرام کیا ہے (۷ : ۳۱)

(م)

مرزا غالبؔ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام

(مصائبِ غدر، قلعۂ معلّیٰ کی تباہی، وفاداری و بغاوت کی ایک قدیم حکایت)

مرزا غالب مرحوم کا سالِ وفات "آہ غالب بمرد" ہے، یعنی ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۹ء) اس لحاظ سے فی الحقیقت اُن کا شمار موجودہ، عصرِ جدید، کے عہد میں ہونا چاہیے۔ ہندستان میں پریس سترھویں صدی[1] کے اواخر میں رائج ہو چکا تھا، اور غدر سے پہلے خود دلی میں حاجی قطب الدین وغیرہ تاجرِ کتب نے بعض پریس قائم کر دیے تھے، پس ان کو اپنی تصنیف و تالیف کے لیے ابتدا ہی سے پریس موجود ملا، اور اپنے حاصلِ عمر کو اشاعت و طباعت کے لیے غیروں پر چھوڑ کر دنیا سے چلے جانے کی مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ جو فی الحقیقت کسی بھی صاحبِ کمال کے لیے زمانۂ گزشتہ کی سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جانکاہ صدمہ رہا ہے۔

ان کی کلیاتِ نظم و نثر اور مکاتیب و رسائل اردو و فارسی کی تمام کتابیں، باستثنائے اردوے معلّا، جو ان کے انتقال کے بعد مرتب ہوئی[2]، ان کی زندگی میں، ان ہی کے زیرِ نگرانی شائع ہو چکی تھیں۔ دیوانِ فارسی غالباً سب سے پہلے مطبع اودھ اخبار، لکھنؤ

---

[1] یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں طباعت کا کام اٹھارھویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا تھا۔ اگرچہ ابتدائی دور کے سب چھاپے خانوں میں انگریزی کے ساتھ عربی نسخ ٹائپ بھی موجود تھا۔

[2] اردوے معلّی ان کی زندگی میں مرتب ہو کر زیرِ طبع ہوئی اور ان کی وفات کے چند ہفتے بعد شائع ہوئی۔

نول کشوری پریس) میں خود چھپوایا۔[۳] اسی طرح سے "مہر نیم روز" پھر مع "دستنبو" مکاتیب فارسیہ بہ اسم "پنج آہنگ" شائع کی۔ قاطع برہان، درفشِ کاویانی، نامۂ غالب تیغِ تیز وغیرہ دہلی میں چھپوائیں۔ دیوانِ اُردو بھی "مطبع اودھ اخبار" میں اور پھر مکرر سہ کرر دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔[۴]

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں جس قدر اُردو کلام کہا گیا وہ نئے ایڈیشنوں میں داخل نہیں ہوا جو پہلا ایڈیشن غدر سے پہلے دہلی میں چھپا تھا، اسی کی نقلیں چھپتی رہیں، برخلاف کلیاتِ نظم فارسی کے جس کا پہلا ایڈیشن اور موجودہ ایڈیشن دونوں میرے پاس موجود ہیں، مگر دونوں کے قصائد وغزلیات وقطعات کی تعداد میں بڑا فرق ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح کا یہ قصیدہ:

در روزگار ما نہ تواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ در یں روزگار یافت

یا ۳۳واں قصیدہ لارڈ ایلن برا والا:

بہر کس شیوہ خاصے در اشیا رست ارزانی
زمن مدح لولارڈ ایلن برا گنجینہ افشانی

اور لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ اور عطائے خطابات کی تبریک:

زسالِ نو دگر آبے بروے کار آمد

وغیرہ قصائد ہیں۔ اسی طرح سر سالار جنگ اعظم (مختار الملک) کی مدح کا مشہور قصیدہ:

سخن سترہ است کہ داستاں نہ گویم

بھی نہیں ہے کہ یہ غدر کے بعد کا لکھا ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کلیاتِ نظم کے ہر ایڈیشن میں نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا، مگر افسوس کہ اُردو دیوان کی قسمت اس بارے میں نارسا رہی، اور نیا کلام

۳۔ کلیاتِ نظمِ فارسی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء میں مطبع دار السلام، دہلی میں چھپا تھا۔

۴۔۔ ان سب کتابوں کی اشاعت سے متعلق دیکھیے: ذکرِ غالب: دوسرا باب (۱۴۳ - ۱۷۵)

اس میں شامل ہوتا نہ رہا۔ اس کا ثبوت وہ معتد بہ غزلیں ہیں جو بعض حضرات کے پاس قلمی موجود ہیں اور مطبوعہ دیوان میں ان کا پتہ نہیں۔
اس قسم کے غیر مطبوعہ کلام میں سے دو اردو رباعیاں میں نے اپنے مطبوعہ نسخے کے حاشیے پر خود مرزا صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں، جو انھوں نے خواجہ فخر الحسین صاحب (فخر الدین حسین) مصنف سروش سخن، کو دیا تھا اور دو قصیدے، دو قطعے، ایک قطعۂ تاریخ اور تین غزلیں اس قلمی نسخے میں ہیں جو نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلی کے پاس موجود ہے۔ اس مرتبہ دہلی میں وہ نسخہ چند دنوں تک میرے پاس رہا اور میں نے تمام غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ اس کے لیے میں نواب صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں۔

قصیدہ

ان نظموں میں اردو کا ایک مختصر قصیدہ ہے جسے آج بہ سلسلۂ ادبیات شائع کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل نئی چیز ہے اور علاوہ غیر مطبوعہ ہونے کے اس سے مرزا مرحوم کے حالات و سوانح پر بھی روشنی پڑتی ہے
اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی دربار ۱۲ جنوری کو منعقد ہوا تھا جس میں حسب معمول مرزا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا، لیکن جب وہاں پہنچے تو ان کی عزت قدیمانہ نشست و ترتیب کا کوئی انتظام نہ تھا، حتیٰ کہ انہیں نہایت ہی ادنیٰ صف میں کرسی ملی۔ یہ دیکھ کر سخت متاسف ہوئے کہ قدیمی باتیں خواب و خیال ہو گئیں:

اس بزم پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشیب میں از روے اہتمام

'از روے اہتمام'۔ یعنی از روے قاعدہ و ترتیب دربار جس میں یہ بہت پیچھے اور عام صفوں میں بٹھائے گئے تھے۔ اس حالت کو دوسروں نے بھی محسوس کیا اور اشارے

ہونے لگے:

دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام

دربار کے بعد انھوں نے چاہا کہ لفٹنٹ گورنر پنجاب سے ملیں اور عرضِ حال کریں، لیکن ریل کا وقت کم رہ گیا تھا اور درباریوں کا ہجوم بھی بہت تھا، ملاقات کا موقع نہ ملا:

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
اس کشمکش میں آپ کا مدّاحِ نامور
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دربار دہلی کے علاوہ کسی دوسری جگہ ہوا ہوگا۔ کیوں کہ ریل کے کھلنے کے وقت کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کا "مدّاحِ نامور" میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سے خطاب ہے یہ معلوم نہیں کہ "آقائے نامور" سے بھی خود وہی مراد ہیں یا کوئی اور۔ تخاطب کے بعد اس طرح کے ضمیر نما وصف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا شخص ہوگا۔[۲]

اس زمانے میں لدھیانہ سے کوئی اخبار نکلتا تھا۔[۳] اس نے دربار کی روداد چھاپتے ہوئے یہ تمام باتیں لکھ دیں۔ اس پر مزید ستم یہ کیا کہ ان کا نام و لقب لکھنے میں کچھ ایسی غلطیاں کر دیں، جسے دیکھ کر ان کا رنج اور دوگنا ہوگیا:

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں، ہے مگر تیغ کا نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا لکھا ہوا
جب یاد آگئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام

---

[۱] اس سے ریل کے چھوٹنے کی طرف نہیں بلکہ افتتاح کے وقت کی طرف اشارہ تھا۔
[۲] مدّاحِ نامور سے خود اپنی طرف (غالب) آقائے نامور سے لفٹنٹ گورنر کی طرف اشارہ ہے۔
[۳] 'لدھیانہ اخبار'، مشنریوں کا فارسی ہفتہ وار اخبار تھا، اس کا جنوری ۱۸۳۵ میں اجرا ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں انھیں معمولی خلعت بھی نہیں دیا گیا اور نہ نذر دینے والوں میں شمار کیے گئے:

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
لمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

لیکن قصیدے سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ کس زمانے کا یہ واقعہ ہے اور کس دربار کا ذکر کر رہے ہیں؟ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد کا یہ دربار ہے کیونکہ لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح ہے، نیز ان کی عمر ستّر برس تھی۔

میں نے اس وقت مولانا حالی کی "یادگارِ غالب" دیکھنا چاہی مگر کتابوں میں ملی نہیں۔ غالباً اس واقعے کے متعلق (اس میں) کوئی ذکر نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ غدر کے بعد کے اس سہ سالہ عہد سے تعلق رکھتا ہے جب کہ قیامِ دہلی، تعلق قلعہ اور فتح دہلی کے بعد عدم حاضری کی وجہ سے ان کا سرکاری وظیفہ بند ہو گیا تھا، ان کی وفاداری مشتبہ سمجھی گئی تھی اور بڑی ہی تکلیف اور شدائد کی زندگی بسر کرتے تھے۔

مصائبِ غدر اور مرزا غالب

غدر میں مرزا گھر سے باہر نہیں نکلے اور آخر تک بند رہے۔ مہاراجہ پٹیالہ کی سرکار سے سپاہی متعین ہو گئے تھے، جو غفران مآب حکیم محمود خان مرحوم اور مرزا غالب دونوں کے مکانوں کی حفاظت کرتے تھے۔

بلّی ماروں میں حکیم (اجمل خان) صاحب کے مکان کے سامنے مسجد ہے۔ بالکل اسی سے متصل مرزا مرحوم کا کوٹھا تھا، جہاں غدر سے پیشتر آ رہے تھے۔ میں جب کبھی وہاں سے گزرتا ہوں تو شوق و عقیدت کی ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ اسی مسجد کے قرب کی نسبت سے کہا تھا:

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے[ش]

ش "الہلال" میں یہ حاشیے کی عبارت تھی جسے قوسین میں درج کیا گیا ہے۔

غدر کی تمام بربادیاں اور اس قلعۂ دہلی کی تمام خونریزیاں ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزریں، جو ہندستان میں ششش صد سالہ حکومت اسلامی کا آخری نقش قدم تھا اور گو بہادر شاہ (رحمۃ اللہ علیہ) خود کچھ نہ تھا مگر اس سے بقائے عظمت و جبروت اسلامی کی ایک بہت بڑی روح زندہ تھی۔ اس کے مٹنے سے اکبر و شاہجہان کا گھر بے چراغ ہوگیا۔ اس کا مٹنا درصل سلالۂ تیمور اور آلِ بابر کا مٹنا تھا۔ معتصم عباسی خود کچھ نہ تھا لیکن جب فتنۂ تاتاریں بغداد کے محل لوٹے گئے تو معتصم کی جگہ ہارون و مامون کی عزت لُٹ رہی تھی:

وما کان قیسا ھلکہ ھلک واحدا
ولکنہ بنیان قوما تھدّ ما[۱]

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لاحاصل مدّاحی کی تھی، اور وہ قصیدے جو عرفی و نظیری کے قصائد کا مقابلہ کرنے کا دم رکھتے تھے، ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کیے گئے تھے، جس کے سر پر جہانگیر و شاہجہان کا تاج تو ضرور تھا، پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا ہاتھ تھا اور نہ کلیم کو زرِ خالص سے تلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ[۲]۔

تاہم وہ جو کچھ لکھتا تھا اس کا مخاطب بہادر شاہ سے نہ ہوتا تھا، بلکہ اس تختِ اعظم کی روحِ صولت و عظمت اس کے سامنے ہوتی تھی جس پر کبھی بیٹھ کر اکبر نے فیضی سے، جہانگیر نے عرفی و طالب سے اور شاہجہان نے کلیم سے مدحیہ قصیدے سنے تھے اور

---

[۱] قیس کی موت صرف اس اکیلے کی موت نہیں ہے بلکہ اس سے تو ایک قوم کی بنیاد ہی منہدم ہوگئی (م)

[۲] شاہجہان نے کلیم کو تہنیتِ عید کے ایک قصیدے کے صلے میں، جس کا مطلع ہے:

نجستہ مقدمِ نور وز و غرۂ شوال
فشاندہ اند چہ گل ہائے عیش بر سرِ سال

سکۂ مرائج الوقت میں تلوایا تھا۔ چنانچہ پانچ ہزار پانچ سو روپے وزن میں آئے جو اسے عطا کیے گئے۔
(شعر العجم جلد ۳ صفحہ ۲۰۸)

جواب بھی نوروز و عید کے دن اس زرد زرد دھوپ کی طرح، جو غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے اونچی اونچی دیواروں اور محرابوں پر دکھائی دیتی ہے، دیوانِ عام و خاص کے طلائی ستونوں کے نیچے چند لمحوں کے لیے نظر آجاتی تھی۔

کہ باوجود خزاں بوے یاسمن باقیست

چناں چہ ان کے اکثر قصائدِ مدحیہ کی تشبیہوں میں اور علی الخصوص اس مدحیہ نثر میں جو "مہرِ نیم روز" میں حضرت بہادر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کرکے لکھی ہے، اُس سوزِ دروں اور آتشِ پنہانی کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے جس کا شعلہ کاروانِ عظمت کے اس آخری مسافر کو دیکھ کر بے اختیار اُن کے دل میں بھڑک اٹھتا تھا، اور جس کو وقت کی نزاکت اور انگریزی حکومت کے ذریعہ وظیفہ حاصل کرنے کے تعلق نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ طماعی و وارستگی نے غالب آکر بظاہر پوشیدہ و افسردہ کردیا تھا۔

فتحِ دہلی کے بعد جو عالمگیر اور عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیانِ شہر پر نازل ہوئی اور جس طرح شاہجہاں آباد کی اُن سڑکوں پر، جہاں کبھی صاحب قرانِ اعظم کی سواری کے لیے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظرِ خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا جو عرصے تک دار الخلافہ کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں۔

فلا تسئلن عما جری یوم حصرہم
وذالک مما لیس یدخل فی حصر[۱]

علی الخصوص قلعۂ معلّا کی بربادیاں جن کے لیے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور جن کے غم میں آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی اُن کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجسادِ محترمہ در فیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبرِ اعظم اور صاحب قرانِ ثانی کے خونِ عظمت و جبروت کے حامل تھے، جنھوں نے چھ صدیوں سے

---

[۱] ان کی محصوری کے دن جو کچھ پیش آیا اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ یہ باتیں گنتی میں نہیں آسکتیں۔

متصل شہنشاہی و فرمانروائی کی گود میں پرورش پائی تھی، جنھیں حکومت و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ ان کروڑوں انسانوں کو، جن کی آبادیاں کابل کے کوہستانوں سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے۔ کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور ان کی لاشیں اس عظمت رفتہ کا ماتم سنائیں، جو چند روز پیشتر دنیا میں صرف انہی کے لیے تھی۔

غدا سمراً بین الانام حدیثهم
وذا سمر یدمی المسامع کالسمر
تحیة مشتاق و الف ترحم
علی الشهداء الطاهرین من الوزر[12]

ان الملوک اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وکذلک یفعلون[13]
(۲۷ : ۳۴)

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے اور دیکھتے رہے یہ وہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے

---

۱۲ ان کی باتیں لوگوں کے درمیان کہانی بن گئیں۔
داستان گو، نیزوں کی طرح کانوں کو خون آلود بنا دیتا ہے
مشتاقوں کی طرف سے ہزاروں سلام اور رحمتیں ہوں
شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک ہیں

۱۳ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، تو اسے خراب کر دیتے ہیں اور اس کے معززین کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں: (۲۷ : ۳۴)

ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں۔

گو ضرورت و احتیاج نے، انھیں انگریز حکّام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا اور مدحیہ قصیدے لکھوائے تھے، تاہم مرزا صاحب مشفقِ مہربان کے خطابات اور ساٹھ ستر روپے کا خلعت اس زخمِ کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا جو حوادثِ غدر سے ان کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات اور جذبات مٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمٰی کے موقعوں پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدّار و ملّت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی۔

الزامِ بغاوت:

چناں چہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کا جو اثر ایک مسلمان ہندستانی کے قلب پر پڑنا تھا، مرزا مرحوم پر بھی پڑا، اور ان کی غیرت و حمیت نے گوارا نہ کیا کہ فتحِ دہلی کے بعد حکام کے سامنے جا کر خوشامد و عاجزی کریں اور اس عیش و نشاطِ تازہ کا تماشا دیکھیں، جو دہلیِ مرحوم کی بربادی کے غم و ماتم سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ خود ہی کہہ چکے تھے:

ہر جادہ کہ از نقشِ پے تست بہ گلشن
چاکیست بہ جیبِ ہوس انداختۂ ما

ان کے تعلقات حکامِ انگریزی سے ابتدا سے خوشامدانہ تھے۔ ان کا وظیفہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کم بخت وظیفے کو واگزار کرانے کے لیے انھیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح میں اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر و جہانگیر کی مداحی ہو رہی ہے۔ پھر وقت بھی ایسا پر آشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا اور سُولی کے تختے اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے

وہ بڑی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے۔ تاہم ان کی طبیعت کچھ اس طرح بیزار ہوئی کہ فتح دہلی کے بعد قلعۂ دہلی میں وفادارانِ سرکار جمع ہوئے۔ انعامات و سندات ملیں، ان تمام لوگوں نے بڑی کوشش کرکے اپنے تئیں نمایاں کیا جنھوں نے غدر میں حصّہ نہیں لیا تھا اور اس کے صلہ و اکرام سے مالامال ہوئے۔ مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے اور کسی حاکم کے آگے جاکر اس کا منتقم و قاہر چہرہ نہ دیکھا۔

بعد میں اپنی برئیت کے لیے انھوں نے اس عدم حاضری کے بہت سے وجوہ بیان کیے، مگر اصل حقیقت یہی تھی کہ دلِ دردمند کے ہاتھوں پاؤں بندھ گئے اور مصلحت و ضرورت کی عاقبت اندیشیوں کی بھی کچھ نہ چلی۔ بعد کو ہوش آیا، تو عذر بناکر پیش کرنے پڑے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری حلقوں میں عام طور پر اس ہندستان کے سب سے بڑے شاعر کی نسبت ٹھیک اسی طرح، غیروفاداری، کا یقین ہوگیا جس طرح آج کل بہت سے نثر نویسوں کی نسبت یقین کیا جاتا ہے، جو اپنے دلی جذبات و حسیات کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ان کی وہ پنشن بھی بند ہوگئی جو ان کی زندگی کا آذوقہ تھی اور چند جامِ فرنج، گلاب آمیز کا وسیلہ تھی (مرزا مرحوم اپنے فارسی خطوں میں ولایتی شراب کو 'فرنج' لکھا کرتے تھے۔ فرانس اور اسپین شراب سازی کے مرکز ہیں۔ کوئی فرانسیسی شراب پی ہوگی جس کو ساختۂ فرانس ہونے کی وجہ سے فرنج کہہ دیا ہوگا۔ اور انھوں نے اپنے عالمِ وارفتگی میں یہی نام رکھ لیا۔ قاعدہ تھا کہ اس کی تیزی کو کم کرنے کے لیے گاہ گاہ عرقِ گلاب ملا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

انگریزی درباروں میں پرسش و خطاب اور عام تعلقاتِ لطف و نوازش بھی یکقلم موقوف ہوگئے اور پوری طرح عام باغیوں میں شمار ہونے لگا۔

غیر مطبوعہ قصیدہ

یہ زمانہ تین سال تک رہا اور صفائی کی کوشش سود مند نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دربار و خلعت کا نہ ملنا، نذر وغیرہ کا سلسلہ بند ہو جانا، قدیمی عزت و احترام کی یاد، اپنی بے آبروئی و بے عزتی پر حسرت و افسوس، یہ تمام باتیں جو اس میں پائی جاتی ہیں، صرف اسی زمانے کی شکایتیں ہو سکتی ہیں۔ غالباً لارڈ کیننگ نے جنوری ۱۸۶۰ء میں جو دربار آگرے میں کیا تھا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[۱] دہلی سے اس میں شریک ہونے کے لیے آگرہ گئے ہونگے۔ لبِ دریا خیموں کے لگنے، اور ریل کا وقت کم ہونے کے ذکر سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے۔ چناں چہ اس کی تصدیق ان کے بعض فارسی قصائد و قطعات سے بھی ہوتی ہے جو اسی زمانے میں لکھے گئے تھے، اور جو بالکل اسی قصیدے کے ہم معنی و ہم مطلب ہیں، مثلاً غدر کے بعد جو فارسی قطعہ مسٹر ایڈمنسٹن بہادر، لفٹنٹ گورنر صوبۂ شمالی و مغربی کو مخاطب کر کے لکھا ہے، اور جس کا پہلا شعر:

فرزانۂ یگانہ، ایڈمنسٹن بہادر
کاموختت دانش از روے آیین کار دانی

---

[۱] یہ خیال صحیح نہیں۔ ۱۹۳۶ء میں غلام رسول مہر نے مولانا کو اس طرف توجہ دلائی تو ۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کے خط میں انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

"اتنے عرصے کے بعد آج اس مضمون اور قصیدے پر بھی نظر پڑی جو 'الہلال' میں نکلا تھا۔ اب غور کرتا ہوں تو آپ کا خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔۔۔ ریل کے کھلنے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ لفٹنٹ گورنر کی روانگی کا وقت قریب آگیا تھا، یا خود غالب کی روانگی کا، بلکہ صریح یہ ہے کہ ریل کے افتتاح کا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۷ء کو ریل کے افتتاح کا جلسہ ہوا۔ لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اس کا افتتاح کیا۔ تعجب ہے کہ یہ صاف بات کیوں اس وقت سامنے نہیں آئی یقیناً لارڈ کیننگ والا دربار یہ نہیں ہو سکتا۔" (خطوطِ ابوالکلام آزاد: ۱۷۶)

ہے۔ اس میں اپنی مصیبتوں کا افسانہ سُنا کر الزامِ شرکتِ بغاوت سے اپنی برّیت کی ہے؛ اور کہا ہے کہ حکّام کے دل میری جانب سے پھر گئے ہیں، آپ میری مدد کیجیے اور میری صفائی کرا دیجیے۔ چناں چہ لکھتے ہیں کہ میرے تعلّقات انگریزی حکومت سے نہایت قدیمی ہیں۔ میں ہمیشہ حُکّام کی مدح میں قصائد لکھتا رہا اور صلہ و انعام سے شاد کام ہوا۔

از حضرتِ شہنشہ خاطر نشانِ من بود
در مزدِ مدح سنجی صد گونہ کامرانی

یہی حالت تھی کہ:

ناگہ ز تند بادے کان خاست در قلمرو
برہم زداں بنا را نیرنگِ آسمانی

یعنی غدر کا ظہور ہوا:

در وقتِ فتنہ بودم غمگین و بود بامن
زاری و بے نوائی، پیری و ناتوانی
حاشا کہ بودہ باشم، باغی، بہ آشکارا
حاشا کہ کردہ باشم ترکِ وفا نہانی
از تہمتے کہ برمن بستند بدسگالاں
حُکّامِ راست بامن یک گونہ سرگرانی

یعنی غدر کے زمانے میں پیری و ناتوانی کی وجہ سے کہیں آ جا نہ سکا۔ باغیوں سے مجھے کوئی تعلّقِ ظاہر و باطن نہ تھا۔ محض تہمت تراشی سے مقامی حکّام مجھ سے بد ظن ہو گئے ہیں۔

اسی طرح ۱۸۶۰ء میں جب لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے دربار کیا، تو دو مطلعوں کا ایک پُر زور قصیدہ لکھ کر پیش کیا:

زسالِ نو دگر آبے بروئے کار آمد — ہزار و ہشت صد و شست در شمار آمد

اس قصیدے کے آخر میں وہ سب شکایتیں ایک ایک کر کے لکھی ہیں جن کے لیے اس غیر مطبوعہ اُردو قصیدے میں لفٹننٹ گورنر پنجاب سے فریادی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت لکھی ہوئی دونوں چیزیں ہیں۔ فارسی قصیدہ وائسرائے کے پاس بھیجا ہوگا اور یہ اُردو کا غیر مطبوعہ قصیدہ لفٹننٹ گورنر پنجاب کے پاس۔ اُردو قصیدے میں نمبر کرسی، خلعت و نذر، وظیفہ و انعام تین چیزوں کے بند ہو جانے پر افسوس ہے:

لمبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

یہی دُکھڑا اس فارسی قصیدے میں بھی رویا ہے۔ اپنی قدیمی مداحی و وظیفہ خواری کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

بہ ناگرفت چناں صرصرِ زید بدہر
کزاں بر آئینہ آسماں غبار آمد
شرارہ بار غبارے ز مغزِ خاک انگیخت
سیاہ رُو سپہے کاندریں دیار آمد
دریں جگر گسل آشوب کز صعوبتِ آں
سپاہ دار سپہرے بہ زینہار آمد
گواہِ دعویٔ غالب بعرضِ بے گنہی
ہمیں بس است کہ ہرگز نہ رستگار آمد

یعنی غدر کی بادِ صرصر سے مصائب کا غبار چھا گیا۔ اس زمانے میں میری بے گناہی کا بڑا ثبوت یہی ہے کہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا اور اس لیے کوئی مخالفانہ کارروائی میرے خلاف حکّام نہ کر سکے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ اب آپ سے طالبِ لطف و کرم و تلافیِ مافات ہوں:

کنوں کہ شد ز تو زینت فزائے روئے زمیں
سوادِ ہند کہ چوں زلف تار و مار آمد

خطاب و خلعت و پنشن ز شاہ می خواہم
ہم از نخست بدیں وایہ ام قرار آمد
پس از سہ سال کہ در رنج و پیچ و تاب گزشت
سر گزارش اندوہ انتظار آمد

خطبۂ صدارت

اِجلاسِ خصوصی

انڈین نیشنل کانگریس

دلّی، ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء

نمایندگانِ قوم، خواتین اور حضرات!

قومی جدّوجہد کے ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں جیساکہ آج درپیش ہے، آپ حضرات حالات کے تقاضا سے مجبور ہوئے کہ سال کے اختتام سے پہلے اس ایوانِ قومی میں جمع ہوں، اور وقت کی مشکلات کے لیے حل اور رہنمائی حاصل کریں۔ اگر میں کہوں، یہ وقت کام اور مقصد کی مشکلات کا ایسا اجتماع ہے جس کی اس ایوان کی تاریخ میں کوئی نظیر موجود نہیں، تو میں سمجھتا ہوں، یہ ایسی بات ہوگی، جو آپ میں سے ہر شخص محسوس کر رہا ہے۔

تین سال ہوئے، جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بمقام کلکتہ جمع ہوئے تھے، تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان دن تھا۔ لیکن اس دن کی عظمت قوموں کے ان دنوں کی مانند تھی، جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے اُن ایام کی جھلک پائی جاتی ہے، جن میں قوموں کو جنگ کی فیصلہ کن دشواریوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اُس دن آپ جنگ کے آغاز کے لیے فکرمند تھے، آج اس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اُس وقت آپ کو سفر کی جستجو تھی، آج گمرہی کا خطرہ پیش آگیا ہے۔ اُس وقت آپ ساحل پر کشتی کے لیے مضطرب تھے، لیکن آج زندۂ جاوید حافظ کے لفظوں میں "کشتی ایک کنارے سے چل چکی ہے مگر دوسرا کنارہ

ابھی دُور ہے اور موجیں گھیرا ڈال رہی ہیں"۔ حضرات! جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی، تو مجھے آپ کی جانب سے عزّت اور اعتماد کا ایک ایسا عظیم پیام ملتا ہے، جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں، بلکہ صرف آپ کے فیاضانہ حسنِ ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی ناچیز خدمات کے ذریعہ آپ کا ایسا اعتماد حاصل کر سکا ہوں، تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ یہ میرے وطن و قوم کی جانب سے قبولیت کی ایک بہت ہی بڑی سند ہے۔ میں اس عزّت کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں، مگر اُس ذمّہ داری کے لیے جو آپ کے اعتماد کی مقدس امانت ہے۔ آپ ہی سے ہمّت و اعانت کی التجا کرتا ہوں۔ بلا شبہ آج ہمیں ایک نہایت مشکل وقت میں نہایت مشکل کام درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یقین متزلزل نہیں ہے، اور گو ہمیں اپنی تدبیروں کی طرف سے شبہات رہے ہوں، لیکن ہمیں اپنے مقصد کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ کوششیں حق اور انصاف کے لیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ خدا کی زمین میں اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کام ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ ایسا ہو۔ پس، یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اپنی درماندگیوں اور کمزوریوں کا اقرار ہو، ہم وقت کی آزمائشوں اور راستے کے کھٹکوں کی طرف سے فکرمند ہوں۔ ہمیں مشکلوں اور رکاوٹوں کی سختیوں سے پورا پورا اندیشہ رہے، لیکن ہمیں نتیجہ کی طرف سے کبھی ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ خدا کی جس رحمت نے ابتدا کی بے سروسامانیو میں ہمارا ساتھ دیا تھا، وہ درمیان کی اس آزمائش میں بھی ہماری دستگیری کرے گی اور بالآخر انجام کی فتحمندی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

ایک وقفۂ نظر:

حضرات!

میں آج اپنے بحث و نظر کے محدود دائرے سے بیخبر نہیں ہوں۔ خیالات کا ہجوم اور مطالب کی وسعت کتنی ہی میرے لیے ضبط آزما ہو، لیکن میں ان حدود کی طرف بڑھنے

سے اپنی نگہبانی کرونگا، جو آپکے سالانہ اجلاس کے صدر کے لیے محفوظ رہنا چاہییں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ اس کی صدارت کے لیے ایک بہتر انتخاب کر چکے ہیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں کہ یہ ایک انقلابی دَور ہے اور منجملہ انقلابات کے ایک انقلاب اس خیال میں بھی ہو چکا ہے، جو کبھی اس ایوان کی ادبی روایات میں بمنزلۂ رسم و قاعدہ کے تھا۔ اب آپ صدرِ مجلس سے متمنّی نہیں ہیں کہ وہ آپکے سیاسی لٹریچر میں کوئی ضخیم اضافہ کرے، یا اپنی تھکا دینے والی فصاحت سے آپ کے حوصلۂ سماع کا امتحان لے۔ برخلاف اس کے آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد آپ سے کہ دے کہ کام شروع کیجیے۔ آپ کے جذبات کا یہ تغیّر فِی الحقیقت اُس بنیادی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ ہندستان کی قومیت بحث و نظر کا ابتدائی دَور طے کر کے عمل کی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے اور اس لیے قدرتی بات ہے کہ آپکے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہے اور اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی، بلکہ عمل کی سادگی ہے۔ پس اگر آج میں اس اجلاس کے اصلی مقصد کے سوا اور تمام ضمنی اور ذواحی اذکار سے چشم پوشی کر لوں، اور جو کچھ عرض کروں، اس میں سادگی و اختصار ملحوظ رکھوں، تو میں امید کرتا ہوں آپ ایسی بات ہوگی جس میں اپنی خواہش سے زیادہ آپ کی خواہش کی تعمیل کرونگا۔

وقت کے مسائل:

لیکن اگر میں وقت کے حالات و مسائل پر بھی نظر ڈالتا، جب بھی میرے لیے گویائی پر خاموشی ہی کو ترجیح تھی۔ ہمارے لیے اب وقت کی کونسی بات ہے، جو نئی ہو سکتی ہے؟ اور جس کا ہم اس لیے ذکر کر سکتے ہیں کہ اس سے ہماری معلومات یا محسوسات کے لیے کوئی نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب ہندستان کی قومیت کا احساس صرف اس حد تک پہنچا تھا کہ دفتری اقتدار کی ناانصافیوں پر نکتہ چینی کرے۔ پھر نکتہ چینی شکایت میں مبدل ہوئی اور شکایت نے احتجاج اور سوال کی صورت

اختیار کرلی۔ ایک مدت تک ہمارا طرزِ عمل یہ رہا کہ ہر نئی ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منھ سے نکل جاتی تھی، لیکن اب معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجائش رہی ہو۔ ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہو گئے ہیں، گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ اب ناانصافیوں کا ذکر نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ اپنے عمل ویقین میں شک کرنا ہے۔ ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجۂ یقین تک آچکی ہے، اس میں نہ تو مزید اضافہ ہوسکتا ہے، نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ برابر ہوتا رہیگا، جب تک ہم اسے خود نہ رل دینگے۔ ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے، جن کی تبدیلی حالات پر مؤثر ہو۔ ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے، جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نامنصفانہ ہے، اور اگر یہ اس وقت تک قائم رہا ہے، تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچا دیے ہیں۔ پس ناانصافی جب کہ اس کا عمل نہیں ہے، بلکہ خاصّہ ہے، تو ہمیں نہ تو متعجب ہونا چاہیے اور نہ شاکی، بلکہ صرف کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قائم نہ رہے۔

قدیم حقیقت اور نیا اعتراف

البتہ میں حقیقتِ کہنہ کے ان تازہ اعترافات کا پوری کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم بجالاتا ہوں جو ہمارے ان بھائیوں کی زبانوں پر بھی جاری ہو گئے ہیں، جنھیں ہمارے طریقِ عمل سے مایوسی کی شکایت تھی۔ بلاشبہہ نام نہاد اصلاحی کونسلوں کے سہ سالہ تجارب، محصولِ نمک، پبلک سروس کمیشن اور مختلف محکموں کے ہندستانی بنانے کے معاملات میں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ کینیا کے فیصلہ میں بھی ہم کوئی ناانصافی نہیں پاتے، بلکہ یہ ایک قدیم اور متوقع ناانصافی کا صرف تازہ اعادہ ہے۔ اس میں قومی اور نسلی تعصّب کا جذبہ ہے اور وہ اب سے پہلے کب نہ تھا۔ اس میں برطانی مواعید کی شکست ہے اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات کے بعد کم از کم برطانیہ کے "وعدوں"

کی شکست میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی ہے۔ اس میں ہندستان کی عزت سے انکار ہے، لیکن ہماری معلومات میں کوئی نظیر اس کے عزم و احترام کے اقرار کی بھی موجود نہیں۔ تاہم ان حضرات کے لیے ان معاملات میں ایسے انکشافات ہوئے ہیں، جن کی تجربہ کی تکمیل اور حقیقت کے اعتقاد کے لیے ضرورت تھی۔ اب ان میں سے اکثر معترف ہیں کہ "نام نہاد اصلاحات محض دھوکے کی ٹٹی ہیں" اور "ہندستان کی خودداری کی حفاظت موجودہ حالات میں ناممکن ہے"۔ نیز "برطانیہ کے ٹوٹے ہوئے وعدوں پر اب کوئی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا"۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بائیکاٹ کے سوا چارۂ کار نہیں ہے اور یہ کہ امپریل نمائش کا ہندستان کو پوری قوت کے ساتھ بائیکاٹ کرنا چاہیے۔

حضرات!

ہم اس موقع پر ہرگز اس بات کی شکایت نہیں کرینگے کہ انھوں نے حقیقت کے اعتراف میں دیر کی۔ ہم یہ بھلا دینگے کہ حقیقت اس تین سال سے پہلے بھی بنقاب تھی، جس قدر فیصلۂ کینیا کے بعد آج نظر آرہی ہے۔ کیونکہ حقیقت کا اعتراف جلد کیا یا بدیر! بہرحال اعتراف ہے اور اس تحسین کا مستحق ہے جو اعترافِ حقیقت کے لیے ہونی چاہیے۔ ہم اُن سے صرف یہ کہینگے کہ آپکے وطن کو بھی اسی طرح ضرورت ہے، جس طرح تین سال پہلے تھی۔ اگر واقعی ہم سب کا اعتقاد ہے کہ ہندوستان کی عزت کی حفاظت کا وقت آگیا، تو کیوں نہ ہم اپنے اختلافات کے باوجود بھی اس ایک مقصد میں متحد ہو جائیں کہ ہندوستان کی عزت بچائی جائے۔

ترکی کی فتحِ عظیم

حضرات!

مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب سے پہلے جس بات کے متوقع ہونگے، وہ یہ ہے کہ میں آپ کے ایک پُرجوش جذبۂ تہنیت کی ترجمانی کی عزت حاصل کروں، جو آپ کی قومی جدوجہد کی تاریخ سے ایک عجیب مگر پُرفخر وابستگی رکھتا ہے اور جس میں آپ کی تاریخ

کی ایک شاندار داستانِ عمل پنہاں ہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ مشرق کے دو دُور دراز ملکوں کو انصاف اور آزادی کے نام پر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دے کہ ایک کی مصیبت پر دوسرے کی زبان سے آہ نکلے، اور ایک کی فتحمندی میں دوسرے کے لیے فتح و مراد ہو۔ یہ مشرق کے دو بعید گوشے جنھیں انصاف اور آزادی کی یگانگت نے اس قدر قریب کر دیا ہے، کون ہیں؟ یہ ہندستان ہے، جس نے عین اُس وقت جب کہ اُسے خود اپنی آزادی کا دشوار گزار مرحلہ در پیش تھا، خلافت اسلامی اور حکومتِ ترکی کی آزادی و خود مختاری کو بھی اپنی آزادی کی طرح اپنا قومی مطالبہ قرار دیا؛ اور یہ ترکی ہے اور اس کی جدید قومیت کا ظہور ہے، جس کی انقلاب انگیز فتحمندیوں کا دنیا نے ایک زندۂ جاوید معجزہ کی صورت میں شاہدہ کیا ہے، اور جس کی فتحمند حبّ الوطنی کی روح تمام سرزمینِ مشرق کے لیے زندگی اور عمل کا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوئی ہے۔

حضرات!

ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے، جب آپ نے اسی ایوان میں انگورہ کے محب الوطنوں کو ان فتوحات پر مبارکباد دی تھی، جو ترکی فوجوں نے میدانِ جنگ میں حاصل کی تھیں۔ فی الحقیقت یہ فتوحات ایک آنے والی فتحِ عظیم کا پیش خیمہ تھیں، لیکن ان میں میدانِ سیاست کی ذہنی اور معنوی فتوحات کا پیغام مضمر تھا۔ یہ اس بے نقص اور بے داغ فتح کی ابتدائی قسط تھی، جس کی تکمیل میں دنیا ایک گری ہوئی عظمت کے سنبھالے کی جگہ ایک نئی عظمت کی تعمیر دیکھنے والی تھی۔ یہ گویا دنیا کے نام ایک اعلان تھا کہ قوموں کی صفیں ایک نئی فتحمند قوم کے استقبال میں چشم براہ ہو جائیں۔ یہ فتح و ظفر کا ایک بے روک کوچ تھا جس کی راہ میں اگرچہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی طاقتیں اپنے بے پناہ منصوبوں اور اٹل رکاوٹوں کے ساتھ حائل تھیں، لیکن وہ اپنے جذبۂ حب الوطنی کے اچنبھوں اور ہوشربا باتوں سے تاریخ کے لیے ایک پیامِ اعجاز لیے ہوئے بے خوف بڑھتا رہا۔ بالآخر وہ وقت آگیا، جب کوچ نے منزل پہ دم لیا۔ اور تاریخ نے بڑھ کر اپنے

دروازے کھول دیے، تاکہ ایک نئی فتحمند قوم کا خیر مقدم بجالائے۔ گذشتہ جولائی کی چوبیسویں تاریخ کو جب لوزان میں ترکی صلحنامہ پر دستخط ہوئے، تو فی الحقیقت یہ ایک نئی قومی عظمت کی پیدائش کا دن تھا۔ یہ اُن تمام فتحمندیوں کی تکمیل تھی، جن کی ایک قوم کو زندگی اور عزت کے لیے ضروری ہو سکتی ہے۔ اِس میں فوجی فتحمندی سے زیادہ سیاسی فتح تھی۔ اور دونوں سے بڑھ کر وہ فکری اور معنوی فتح، جن کے بغیر جنگ اور سیاست کی فتحمندیاں بھی ہیچ ہیں۔

ایک عالمگیر مبارکباد

حضرات!

اس فتحِ عظیم پر ہندستان اپنی گرمجوشی اور مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے جس قدر بھی نازاں ہو، کم ہے۔ ہندستان اس واقعہ کی صورت سے زیادہ، اس کے معانی کی وسعت کا رازشناس ہے۔ وہ ترکی کی فتح میں نہ صرف اپنے مطالب کی فتح، بلکہ تمام سرزمینِ مشرق کی فتح کا نظارہ کر رہا ہے۔ میں سب سے پہلے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں ہندستان کا یہ ہدیۂ ارادت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ پھر انگورہ کی قومی مجلس کو اس کے نئے جمہوری دَور کی فتحمندیوں پر مبارکباد دیتا ہوں؛ اور بالآخر ہم سب کی نگاہیں بے اختیار موجودہ عہد کی اس عظیم ترین شخصیت کی طرف اُٹھ جاتی ہیں، جس کا وجود فی الحقیقت ان تمام مبارکبادیوں کا اوّلین مخاطب ہے یعنی غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو ہندستان کی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں۔

حضرات!

میں نے ہندستان اور ترکی کا ذکر کیا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس مبارکباد کے اصلی مطالبہ سے ابھی عہدہ برآ نہیں ہوا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ کسی سرزمین یا قوم کی نسبت محدود کی جائے۔ یہ کشمکش جو پانچ برس سے دنیا کی صلحِ عام کو ملتوی کر رہی تھی، محض قوموں اور حکومتوں کی جنگ نہ تھی۔ عصمت پاشا

کے فحمند تدبّر اور لارڈ کرزن کی دھمکیوں میں صرف ترکی اور برطانیہ یا مغرب و مشرق ہی کی نمایندگی نہ تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز مضمر تھی۔ یہ دراصل اصولوں کی جنگ تھی اور متقابل عقیدوں کا معرکہ تھا۔ ایک طرف طاقت کا گھمنڈ تھا، دوسری طرف حق اور انصاف کی بے سروسامانی تھی۔ طاقت کا دعویٰ تھا کہ کمزور قوموں کو زندگی کا کوئی حق نہیں۔ انصاف کا عاجزانہ اعلان تھا کہ زندگی کا حق ہر اس قوم کو ہے، جو زندہ رہنے کا ارادہ کرلے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے، عرصہ تک کشمکش جاری رہی۔ بالآخر خدا کی مرضی نے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔ طاقت کو باوجود اپنے تمام سروسامان کے شکست ہوئی اور انصاف نے اپنی ساری بے سروسامانیوں اور رسوائیوں کے ہوتے ہوئے فتح پائی۔ پس فی الحقیقت ترکی کی فتح اس سے زیادہ تر ہے کہ اسے ایشیا یا مشرق کی فتح سے تعبیر کیا جائے۔ وہ انصاف کی جیت ہے اور انصاف مغرب و مشرق کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے، نہ کوئی قومیت؛ اس کی قومیت اگر ہو سکتی ہے، تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔ پس مجھے اجازت دیجیے کہ میں عالم انسانیت کی اس فتح پر تمام عالمِ انسانیت کو مبارکباد دوں، میں مغرب اور مشرق کے ہر اس انسان کو مبارکباد دوں، جو انصاف اور انسانی آزادی کا احترام کرتا ہے۔

ناکام ناانصافی

لوزان کے صلح نامہ سے وہ تمام مقاصد بہ استثنائے آزادیٔ عرب حاصل کر لیے گئے، جن کا ترکی اور ہندستان نے انصاف اور حق کے نام پر مطالبہ کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن کی ان فراموش شدہ شرطوں اور برطانیہ کے ان مشہور مگر شکستہ وعدوں کا بھی مفاد موجود ہے، جو ۱۹۱۸ء میں کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولسن کی بارھویں شرط یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت محفوظ رکھی جائیگی۔ چنانچہ آج ترکی کی سلطنت موجود ہے۔ برطانی وزیر اعظم نے کہا تھا کہ ترکی کو تھریس اور ایشیاے کوچک کے زرخیز اور شہرۂ آفاق علاقوں سے محروم نہیں کیا جائیگا۔ اب ترکی ان علاقوں سے محروم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس میں

نہ صرف ان "وعدوں" کا مفاد ہی موجود ہے، بلکہ وہ باتیں بھی موجود ہیں، جو ان میں نہ تھیں ۔ ان میں ترکی کی خود مختارانہ عظمت کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن اسے یہ بھی حاصل ہو گئی ہے ۔ ان میں اجنبی امتیازات (کیپی چولیشنز) اور غیر ترکی ڈاکخانوں کے اٹھا دینے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی، جو قبل از جنگ بھی عثمانی شہنشاہی کی کامل خود مختاری کی نفی کرتے تھے ؛ اب وہ بھی اٹھا دیے گئے ہیں ۔ ان میں ہم کہیں اس کا اشارہ نہیں پاتے کہ ترکی سے ایک ہارے ہوئے حریف کی طرح نہیں، بلکہ ایک مساوی طاقت کی طرح معاملہ کیا گیا ۔ برخلاف اس کے ہم ان "وعدوں" کو درۂ دانیال کے بین الاقوامی کر دینے کا ذکر موجود پاتے ہیں ۔ لیکن صلحنامہ نے وہاں بھی ترکی کا اقتدار تسلیم کر لیا ہے ۔ بلاشبہہ یہ جو کچھ ہوا، وعدوں کا منعاد ہے اور انصاف کی تعمیل ہے ۔ لیکن واقعات کی تکمیل کے لیے مجھے اتنا اضافہ اور کرنے دیجیے کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ وعدے پورے کیے گئے، بلکہ اس لیے ہوا کہ وعدے فسخ کیے گئے ؛ اور طاقت کے وعدے اگر بزور شمشیر فسخ کر لیے جائیں، تو وہ وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیاض ہے ۔ وہ فاتح کو سب کچھ دے دیتی ہے، لیکن انصاف کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا ۔

حضرات !

یہ صلح فی الحقیقت ایک سوال ہے جس کے جواب میں عنقریب تاریخ عبرت کی داستانیں ترتیب دیگی ۔ بلاشبہہ انصاف پورا ہوا، اور حق حقدار کو مل گیا، لیکن ان طاقتوں کو کیا ملا، جنھوں نے انصاف کی پامالی کے لیے اپنی اٹل اور بے روک سرکشی کی قسمیں کھا لی تھیں ؟ برطانیہ کو کیا ملا، جو کامل چار سال تک اپنے ٹوٹے ہوئے وعدے کے ٹکڑے روندتی رہی اور ایک ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ جو اس نے انصاف کے لیے کبھی نہیں کیا، ظلم و جبر کی تکمیل کے لیے وقف ہو گئی ۔ اس نے ترکی کو پامال کرنا چاہا، مگر وہ اس

ــــــ (CAPITULATIONS)

کے سارے منصوبوں اور فیصلوں کے خلاف طاقتور ہوگئی۔ اس نے انصاف کے آگے جھکنے سے انکار کیا، لیکن وہ تلوار کے آگے سربسجود ہوگئی۔ اس نے بار بار قلم سے فیصلے لکھے لیکن وہ سب تلوار سے پارہ پارہ کر دیے گئے۔ اس نے قوموں کے حاکم اور قسمتوں کے مالک کی طرح جب صلحنامے ترتیب دیے تو ہندستان نے حق اور انصاف کے نام پر فریاد کی، مگر اس نے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا۔ لیکن جب مصطفےٰ کمال نے تلوار کی نوک سے خود اپنا صلحنامہ لکھ دیا، تو وہ ایک مفتوح کی طرح جھکی اور اس کے استقبال سے انکار نہ کر سکی۔ ہمیں مؤرخ کے جواب کا انتظار نہیں ہے کیونکہ دنیا نے جواب دے دیا ہے۔ فی الحقیقت اس نے ترکی کو سب کچھ دے کر خود جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ ناکام ناانصافی کا داغ ہے جو پہلے اس کی پشت پر تھا مگر اب اس کی پسند کے مطابق اس کی پیشانی پر نمودار ہو گیا ہے۔

جدید مشرق:

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حوادثِ عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہے، وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آئی۔ ہم دراصل ایک ایسے عہدِ انقلاب سے گزر رہے ہیں جو ٹھیک ٹھیک ان وقتوں کے مانند ہے، جن میں مؤرخینِ عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ اس کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں، اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے۔ اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے نقشے کے حدود اور خطوط بھی ہل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے، جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبلِ قریب کے دامن میں کیا ہے! تاہم جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ایک

نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل ہی صاف ہے جس کے لیے کسی کی کہانت کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی وہ بیداری جو چوتھائی صدی سے صرف بیداری ہی تھی، اب بیداری کے بعد کی منزلیں طے کر رہی ہے اور جنگِ عظیم کی پھیلائی ہوئی ہلاکتوں نے زندگی اور حرکت کی ایک نئی روح مہیا کر دی ہے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے سحر کار ہاتھوں نے صرف ترکی کے بختِ خفتہ ہی کو بیدار نہیں کیا، بلکہ مشرق کے دروازے پر بھی دستک دے دی۔ اب اس کی گونج ایک طرف وسطِ ایشیا کے میدانوں میں پھیل رہی ہے دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں اور ساحلوں پر سے گزر کر بحرِ ہند کی لہروں کو عبور کر رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی بازگشت عنقریب مشرق کے ایک ایک گوشے سے بلند ہو گی!۔

حضرات!

ہندستان مشرق کی اس عام جدّوجہد سے اپنی قدرتی اور جغرافیائی وابستگی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جدّوجہد کو اس سے منسلک کرتا ہوا ربطِ دیگانگت کے وہ تمام جذبات محسوس کر رہا ہے، جو ایک سرزمین کی مختلف جماعتوں میں وقت، حالات اور مقصد کی یکسانی قدرتی طور پر پیدا کر دیتی ہے۔ پس، وہ مشرق کی ہر اس قوم کا خیر مقدم کرتا ہے، جو آزادی کے لیے جدّوجہد کر رہی ہے، اور ہر اس قوم پر افسوس کرتا ہے، جو اس راہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہے۔ وہ مصر، شام، فلسطین، عراق، مراکش اور دیگر اقطاعِ مشرق کے تمام محب الوطنوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں دل ان کی کامیابی کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ ان کی آزادی کو بھی اس سے کم محبوب نہیں رکھتے، جس قدر خود اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کو۔

جزیرۃ العرب

علی الخصوص وہ جزیرۃ العرب کے استقلال و حفاظت کے لیے اپنے عہدِ قدیم کو آج پھر تازہ کرتا ہے۔ یہ مطالباتِ خلافت کی سب سے زیادہ اہم اور غیر مبدّل دفعہ تھی جس کا ۱۹۲۰ء میں اس ایوان نے اعلان کیا۔ ہندستان کے لیے یہ مطالبہ صرف اسی لیے اہم

نہیں ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مذہبی اعتقاد اس سے وابستہ ہے، بلکہ ہندستان خود اپنی آزادی کے لیے بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہندستان، مصر اور عرب کی جغرافیائی اور طبیعی حالت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ان کی سیاسی قسمت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہے اور ان میں ہندستان کا وجود زنجیر کی پہلی کڑی کی طرح اپنے دونوں ہمسایوں کے لیے ہر چیز کی ابتدا ہے۔ یہ ہندستان ہی کی غلامی ہے جس کو دائمی بنا دینے کے لیے ضروری ہوا کہ نہر سویز برطانیہ کے قبضہ سے باہر نہ ہو۔ اور اب عرب کا استقلال بھی صرف ہندستان ہی کی بدقسمتی پر قربان ہو رہا ہے۔ عرب، جس کی آزادی ہندوستانی فوجوں ہی کے ذریعہ پامال کی گئی، اگر برطانی اقتدار کا ایک نیا ایشیائی مرکز بن گیا، تو پھر ہندستان کی غلامی کی سرحدیں بحرِ ہند ہی سے شروع نہ ہونگی، بلکہ ایک طرف شام کے ساحلوں پر اس کی دیوار کھڑی ہو جائیگی، دوسری طرف خلیج فارس سے گزر کر موصل اور دیار بکر کے حدود سے اس کا آغاز ہو گیا۔ ہندستان عرب کے تمام باشندوں کو یقین دلاتا ہے کہ اُن کا استقلال اور اجنبی اقتدار سے تحفظ اس کی جدّوجہد کا اب بھی ویسا ہی مقصد ہے، جیسا کہ ۱۹۲۰ء کے اعلان میں تھا۔ وہ اس وقت تک اپنی جدّوجہد جاری رکھیگا، جب تک عربی ممالک کا کوئی ایک گوشہ بھی اجنبی اقتدار سے آلودہ رہیگا۔

قسطنطنیہ اور یروداجیل

حضرات!

جب کہ ہم ترکی کی فتحِ عظیم کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالیشان ایوانِ خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں، تو بے اختیار ہمارا خیال ہندستان کے ایک قید خانہ کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے جس کی ایک کوٹھڑی کے اندر ہندستان کی سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارکباد دی جائے، تو وہ ہندستان کے قائدِ اعظم مہاتما گاندھی

ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں، جنھوں نے اوّل نظر ہی میں اس مسئلہ کی ساری وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کرلیا اور تمام ہندستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں، بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے۔ حضرات! ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں مطالبات خلافت کے لیے جو جدّوجہد کی، وہ فی الحقیقت موجودہ عہد کا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے، جس کے نتائج پر تاریخ بحث کریگی۔ شاید یہ ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم اس کے تمام نتائج کا اندازہ کرنا چاہیں۔ تاہم بعض نتائج تو ایسے ہیں، جو بلاکسی بحث و نظر کے ہم سب محسوس کر رہے ہیں۔ اور جن میں سے ہر نتیجہ اس درجہ عظیم ہے کہ صرف اسی کے لیے یہ جدّوجہد ظہور میں آسکتی ہے۔

ہندو مسلم اتّحاد کا مسئلہ جس کے بغیر ہندستان کی آزادی ایک خواب پریشاں سے زیادہ نہیں، اسی کی بدولت ان مشکلات پر غالب آگیا جو عرصہ سے اس کی راہ میں حائل تھیں۔

ہندستان کا تمام مشرق میں وہ بین القومی وقار جس نے مشرق کے جدید بیدار حلقہ میں اسے ایک وسیع جگہ دے دی، اسی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ جدّوجہد وقوع میں نہ آتی، تو آج ہندستان کی تمام ایشیا اور افریقہ میں کیا حیثیت ہوتی؟ ترکی اور عرب کی آزادی اسی کی فوجوں کے ذریعہ پامال کی گئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تمام مشرق کی متفقہ نفرت اور حقارت اس کے حصّہ میں آتی۔ جہاں کہیں بھی ایک ہندستانی نظر آجاتا، انگلیاں اٹھتیں کہ یہ ایک بدبخت ملک کا باشندہ ہے۔ یہ صرف اپنی بدبختی پر قانع نہیں ہے، بلکہ مشرق کی آزاد قوموں کے لیے بھی بدبختی کا ذریعہ ہے۔ لیکن آج حالت بالکل پلٹ چکی ہے۔ آج ہندستان سر اٹھاکر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دامن پر اس کی بے بسی نے جو دھبّہ لگا دیا تھا، اس کی مرضی اور اختیار نے اسے دھو کا دیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تھا کہ بلا اپنی مرضی اور خواہش کے ہزاروں ہندستانی میدان جنگ میں گئے، تاکہ ترکوں اور عربوں

کی آزادی کے خلاف تلوار اٹھائیں، تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ خود اپنی مرضی اور خواہش سے ہزاروں ہندستانی جیل خانوں میں گئے، تاکہ ترکوں اور عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ آج مشرق کے ایک ایک گوشہ سے ہندستان کے لیے عزّت و احترام کی صدائیں اٹھ رہی ہیں قسطنطنیہ میں اس کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، گویا وہ مشرق کی آزادی کا علمبردار ہے۔ قاہرہ کے بازاروں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ اللہ ینصر کے یا غاندی (اے گاندھی، خدا تجھے فتحمند کرے)۔ یہ فی الحقیقت آزاد قوموں کی سی عزّت ہے، جو محکوم ہندستان نے حاصل کرلی ہے۔ اور یہ بلاشبہہ اسی تحریکِ خلافت کا نتیجہ ہے۔ پھر ان دونوں نتائج سے بھی بڑھ کر جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے، وہ ہندستان کا وہ حرّیت طلبانہ ذہنی ارتقاء ہے، جو اس جدّوجہد کے ذریعہ اس نے حاصل کرلیا۔ کسی قوم کے آزاد ہونے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کردے۔ جس وقت ہندستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی اور عرب آزادی سے محروم نہیں رہ سکتے، اس نے اپنی قدر شناسی کا ثبوت مہیّا کردیا۔ محکوم قوموں کی نہ تو کوئی خواہش ہوتی ہے نہ مرضی۔ اگر ہندستان کی ترکی کے لیے کوئی مرضی ہے جس کے حصول کے لیے وہ جدّوجہد کرسکتا ہے، تو پھر وہ اپنی آزادی کے کام سے بھی فارغ ہو گیا، کیونکہ آزادی کا حصول دراصل قوم کی مرضی کے نشو نما ہی کا نام ہے۔

حضرات!

میں آپ سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ گزشتہ چار سال کے اندر مطالبات خلافت کے لیے میں نے جو سعی کی، اس کی نسبت میرا ذاتی احساس ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے، بلکہ بحیثیت ہندستانی ہونے کے، یہ میرا قومی فرض ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ہندستان کی تحریکِ خلافت ہندستان کی بڑی سے بڑی خدمت تھی، جو تاریخ ہند کی اس عظیم شخصیت یعنی مہاتما گاندھی نے انجام دی ہے۔

وقت کی مشکلات

حضرات!

میں نے آغازِ تقریر میں آپ سے وقت کی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ ہر جماعتی جدوجہد کی کامیابی کے لیے اتحادِ عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ۔ اس وقت ہم میں شرط کمزور ہو گئی ہے اور اس لیے ہمیں خطرہ پیش آ گیا ہے۔ لیکن میں سب سے پہلے آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ان مشکلات کی نوعیت اور مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیجیے۔ اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہوئی، تو عجب نہیں، ہم ایک دوسرے خطرہ سے دوچار ہو جائیں۔ آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے اور دوسری مایوسی۔ اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا، تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا۔ اور اگر کم کر کے دیکھا، تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہیے، نہ خائف؛ ہم کو مقابلہ کرنا چاہیے اور غالب آنا چاہیے۔ لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں۔ راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

قوانینِ اجتماع کی وحدت

ہمیں چاہیے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین یاد کر لیں، جو اگرچہ ہماری معلومات میں موجود ہیں، لیکن بسا اوقات جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

ہم حرکت اور زندگی کے اس حیرت انگیز کرّہ کی ویسی ہی مخلوق ہیں، جیسی اَن گنت اور نامعلوم مخلوقات اس یکساں گردش کے ساتھ ظہو   آتی رہی ہیں، اور آج بھی اس کی آغوش میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ خود بھی اس کائناتِ ہستی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے، جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کتنا ہے اور کہاں تک ہے۔ لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ وہ اپنی ساری باتوں میں کامل طور پر یکساں ہے اور اگرچہ اس میں زندگی اور حرکت کے بےشمار مظاہر ہیں، لیکن ان سب کے لیے ان کے خالق کی مرضی کی طرح قانونِ حیات بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے اس میں نہ تو کوئی نئی بات ہوتی ہے۔ نہ اس کی کوئی ایک چیز دوسری چیز سے الگ اور مختلف ہے، جو کچھ ایک مرتبہ ہو چکا ہے، وہی ہمیشہ مشابہ

ہوتا ہے، اور جو ایک کے لیے ہوا ہے، وہی سب کو پیش آتا ہے۔ وہ یکساں ہے، ہمہ گیر ہے، باہم مشابہ ہے اور اٹل ہے۔ ایران کے فلسفی شاعر عمر خیام کے لفظوں میں اس کی زندگی کی کہانی ایک ہی ہے جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں دہرائی جارہی ہے" اور فرانس کے مشہور شاعر وکٹر ہیوگو کے زیادہ مختصر لفظوں میں "حوادثِ عالم کی داستان اگرچہ مسلسل ہے مگر محض تکرار ہے"۔

حوادثِ عالم کی اس کامل یکسانیت اور قوانینِ حیات کی اس غیر متبدل یگانگت کی جلوہ طرازی پر جس طرح شاعر کے وجدان نے وجد کیا ہے اسی طرح مؤرخ کی نگاہوں نے مطالعہ کیا ہے، اور فلسفی نے اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ بحیثیت ایک سیاسی عامل کے اس کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ یہ یکسانیت کا قانون جس طرح افراد اور اجسام کے لیے ہے ٹھیک اسی طرح اور عصروں کے لیے بھی ہے جس طرح افراد کا جسم ہے، دماغ ہے اور وہ تمام قویٰ اور خواص ہیں جو جسم و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں، اسی طرح جماعتوں اور عصروں کا بھی جسم ہے، دماغ ہے، نفسیاتی (سائیکلوجیکل) کیفیات ہیں، جو ان کے ترکیبی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں، اور ضرور ہے کہ ایک طرح کی طبیعت اور ایک طرح کے گردوپیش میں ایک ہی طرح کے حالات ہمیشہ پیش آئیں اور ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں، جس طرح افراد کے اعمال و نتائج کا تعلق ان کی شخصیت سے نہیں ہے، بلکہ ان کے دماغی و جسمانی حالات سے ہے۔ ایک طرح کے دماغی و جسمانی حالات میں ہر فرد سے ایک ہی طرح کے افعال کا صدور ہوگا؛ اسی طرح جماعتوں کے اعمال و احوال میں بھی جماعت کا تشخص و تعین بالکل غیر موثر ہے۔ حالات و نتائج ایک خاص طرح کی طبیعت اور گردوپیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی جماعت کی ویسی طبیعت ہوگی اور ویسا ہی گردوپیش آئیگا، ضرور ہے کہ وہ ظہور میں آئیں۔ قوموں کا آغاز و انجام، عروج و زوال، غفلت و بیداری، آزادی و محکومیت، فتحمندی و ناکامی سب پر یہی قانون نافذ ہے اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور جس کے لیے ہوا ہے بجنسہ وہی ہر قوم پر گزرتا اور ہر قوم کو

پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی حیرت انگیز توافق ہے، جس کو تیرھویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی مؤرخ عبدالرحمٰن ابن خلدون نے (جس نے سب سے پہلے فلسفۂ تاریخ کے مبادیات و اصول مدوّن کیے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے: اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں، تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجنسہٖ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے کام دے سکتی ہے کیونکہ ناموں اور صورتوں کے تغیر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو موجودہ زمانہ کے مشہور فرنچ مصنّف ڈاکٹر گستاولی بان نے زیادہ جامع اور علمی پیرایہ میں بیان کیا ہے: جب ہم جماعتی زندگی کی سائیکولوجی اسی طرح مدوّن کر لینگے، جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کی کر لی ہے، تو پھر ہمارے لیے ممکن ہو جائیگا کہ ہم ایک قوم اور تمدّن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدّن کے لیے استعمال کر سکیں۔ ہزار سالہ تقویم کی طرح وہ ہمیں ہر سال یکساں طور پر کام دے سکیگی۔

قومی جدّوجہد کا سفر اور اس کی منزلیں

حضرات!

آج ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ قومی زندگی کے اس قانون کے قطعی اور اٹل احکام سے غافل نہ ہوں۔ صرف یہی بات ہمارے تمام بیجا تعجبوں اور بیجا اندیشوں کو دُور کر سکتی ہے۔ ہمیں آگاہ رہنا چاہیے کہ آج جو کچھ پیش آ رہا ہے، وہ نہ تو نیا ہے، نہ معمول کے خلاف، بلکہ قومی جدّوجہد کے اس مرحلہ کی جس سے ہندستان گزر رہا ہے، ایک بالکل قدیم، معمولی اور ناگزیر حالت ہے۔ در اصل ہم وہ کر رہے ہیں، جو ہمیشہ گزر چکا ہے، اور وہ دیکھ رہے ہیں، جو ہم سے پہلے دیکھا جا چکا ہے۔ ہم کچھ نہیں ہیں، مگر تاریخ اقوام کا ایک صفحہ ہیں، جو اس قانون اجتماع کی یکسانیت کی بیشمار نظیروں پر ایک نئی نظیر کا اضافہ کرتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ قومیں غفلت کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور جب ان کی دماغی اور فکری

حالت کا انقلاب پورا ہو چکا ہے تو ان کی خارجی حالت پر بھی یکے بعد دیگرے تغیرات طاری ہوئے ہیں۔ اگر میں ایک قدیم جرمن حکیم ہرمن کا استعارہ مستعار لوں، تو کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے، ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب دیکھتی ہے۔ جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے، اور بالآخر جدّوجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ جدّوجہد بھی ایک ایسا سفر ہے، جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں، اور ٹھہرائے ہوئے رسم وراہ ہیں، جو ضرور ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں اور ضرور ہے کہ ہر کامیاب قافلہ ان میں سے گزرے۔ جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں، اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بیشمار ہیں؛ اور جس طرح اس کی فتحمندی اٹل ہے، اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔

اس کی مشکلات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ اس میں دماغ کے لیے بھی آزمائشیں ہیں اور جسم کے لیے بھی۔ اس میں اندر کے طوفان بھی اٹھتے ہیں اور باہر کے سیلاب بھی بہتے ہیں۔ اس میں جابجا ٹھوکریں بھی ہیں اور قدم قدم پر لغزشیں بھی۔ اس کا سفر کبھی یکساں رفتار میں جاری نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیشہ رک رک کر چلتا ہے اور تھم تھم کر بڑھتا ہے۔ اس میں گر گر کر اٹھنا پڑتا ہے اور ٹھوکر کھا کھا کر دوڑنا پڑتا ہے اس کی کامیابیاں مسلسل نہیں ہیں، مگر ضروری ہیں۔ اس کی فتحمندی قدم قدم پر نہیں ہے، مگر آخر میں ہے اور اٹل اور یقینی ہے۔

حضرات!

خدا کا یہ قانونِ حیات ہماری تن آسانیوں کی خاطر معطّل نہیں ہو سکتا۔ ہم چلے ہیں، تو ہمارے لیے بھی اس کی تمام منزلیں چشم براہ ہیں، اور ناگزیر ہے کہ ہم ان سب میں سے گزریں۔ اگر ہماری تیز رفتاری رک گئی، تو ہمیشہ رکا کرتی ہے۔ ہمیں تیزی سے پھر روانہ ہو جانا چاہیے۔ اگر ہماری حرکت میں ایک دفعہ وقفہ سا پڑ گیا تو ٹڑا ہی کرتا ہے۔ ہمیں ازسرِنو کوچ کر دینا چاہیے۔ اگر ہم ایک خاص مسئلہ میں متفق نہ ہو سکے یا ہمارے اتحاد کے رشتہ میں ایک گرہ پڑ گئی، تو کوئی مضائقہ نہیں؛ ہم کیوں نہ

متفق ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک آزمائش ہے، جو سب کی طرح ہمیں بھی پیش آگئی ہے اور اس پر اسی طرح غالب آنا چاہیے، جس طرح باہمت قومیں، غالب آتی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ نہ اس میں کوئی ہراس ہے نہ مایوسی۔ یہ کوئی نرالی بجلی نہیں ہے جو ہمیں پر گری ہو، یہ تو اس راہ کا ایک معمولی حادثہ ہے، جو ہماری طرح، نہیں معلوم کتنوں کو پیش آچکا ہے، اور ہمارے بعد کتنوں کو پیش آئیگا۔

ایک آزمائشی منزل:

آیئے! ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دیکھ لیں کہ آج جو مشکلات پیش آئی ہیں، جماعتی اعمال کی نفسیات میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہنا ضروری نہیں کہ فرد کی طرح قوم کے اعمال کا اصلی سرچشمہ بھی دماغ ہے۔ قوم کے افراد کا دماغی نشوونما جب اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ خارج میں بھی اپنا اثبات کرے، تو وہ مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے۔ مناسب حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت کسی ایسے قومی موثر کی ہوتی ہے، جو فکر و رائے کے تمام انتشار و اختلاف پر غالب آکر قوم کے بکھرے ہوئے عناصر کے لیے ایک نقطۂ اجتماع پیدا کر دے۔ افراد کے دماغ جب جماعت کے ترکیبی دماغ میں منقلب ہو جاتے ہیں، تو ان میں عقل و ادراک سے زیادہ جذبات کا عنصر کام کرتا ہے۔ پس یہ مرکز بھی جذبات سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ ادراک سے۔ جب ایسی حالت مہیا ہو جاتی ہے، تو عملی جدوجہد ظہور میں آتی ہے اور بقدر اپنی قوت کے ابھرتی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہے۔ پھر یا تو کسی معین حد تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، یا راستہ کے قدرتی قوانین کے ماتحت اسے رک رک کر جانا پڑتا ہے۔ اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں، لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک، ردّ عمل (ری ایکشن) کا قانون اپنا اثر دکھلائے۔ اس وقت اچانک ایک افسردگی اور اضمحلال کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک اندھڑ میں بیشمار بکھرے ہوئے اوراق بندھے ہوئے

تھے، یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑ گئی ہے یا کھل گئی ہے۔ اب اختلافات شروع ہوتے ہیں انتشار کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں، اور قومی جدّوجہد کو ایک سخت آزمائش پیش آجاتی ہے چونکہ جماعت کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی طبعی ہے۔ اس لیے علم و ادراک اس میں بہت کم تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ افراد کتنے ہی ہوشمند اور دنیا کے پچھلے تجربوں سے باخبر ہوں، لیکن اپنے جذبات کو ان حالات و نتائج سے نہیں روک سکتے۔ تاہم اگر جدّوجہد کا دماغ اور پھیپھڑا محفوظ ہو، تو یہ جو کچھ ہوتا ہے، جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جدّوجہد کی زندگی کے لیے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ، اور کبھی کبھی ایک خطرناک التوا کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جونہی وہ مدّت ختم ہوتی ہے جو اس نشہ کے خمار کے لیے ضروری تھی۔ معاً افسردگی کا یہ وقتی حجاب دُور ہو جاتا ہے اور جدّوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رُونما ہو جاتی ہے۔ بلکہ اکثر حالتوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے کیونکہ یہ وقتی وقفہ محض سطح کا تھا، گہرائیوں کی قوتیں برابر کام کر رہی تھیں۔ اب دوسرے ظہور میں تازہ قوّت کے ساتھ پچھلی قوتوں کی مقدار بھی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے تمام تغیّرات و حوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی یا ختم ہو جاتے ہیں، یا جاری رہتے ہیں، بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ البتّہ اُتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ ہم غلطی سے اُتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کسی قومی جدّوجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اُتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ پھر کل نہیں چڑھیگا۔

ہماری اس قومی جدّوجہد کو بھی ایک حرکت کے بعد ایک وقفہ پیش آگیا ہے۔ جدّوجہد پوری تیزی کے ساتھ دوڑتی جا رہی تھی۔ یکایک باردولی کے فیصلہ نے اشارہ کیا کہ تھم جاؤ۔ وہ اچانک تھم گئی۔ لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے صدمہ محسوس کیا اور اس سے وہ تمام نتائج اخذ ہوئے، جو ایسے وقفہ کا قدرتی مقتضا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری

جمعیت جنبش میں آگئی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے، گویا ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز تیزی کے ساتھ کھلنی اور بکھرتی جارہی ہے۔ جدّوجہد کا عام سکون، کانگریس کا اختلاف ہندو مسلم اتّحاد میں فتور، اتحاد کی کوششوں کی درماندگیاں، یہ سب اسی حالت کے برگ و بار ہیں۔

حضرات!

یقیناً یہ ایک آزمائش ہے جس پر ہمیں فتحمند ارادوں کے ساتھ غالب آنا پڑیگا۔ اور عجب نہیں کہ بڑی کشمکش کرنی پڑے۔ تاہم امید کرونگا کہ آپ اس سے زیادہ کوئی اثر اپنے دل و دماغ کے لیے قبول نہ کرینگے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اقوام کی نفسیات اور تاریخ کا شناسا ہو، یہ حالت بالکل ایک ایسی معمولی ہے جیسے ایک آدمی کا دوڑتے دوڑتے رُک جانا کہ دم لے کر پھر دوڑے۔

ہمیں اس کی بالکل پروا نہیں کرانی چاہیے کہ ہمارے مخالفین اور نکتہ چین ہماری اس حالت سے دھوکا کھانا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہیں جس میں طاقت کا صرف اسی وقت اقرار کیا جاتا ہے، جب وہ بالکل سامنے آجائے۔ لیکن خود ہم کو نہیں چاہیے کہ اپنی حقیقتِ حال کی نسبت کسی قسم کا شبہہ قبول کریں۔ کیا ہے، جو ہم نے کھو دیا ہے؟ ہماری جدّوجہد کے تمام دماغی قوی پوری طرح مضبوط ہیں۔ اس کی جڑوں میں اب تک کوئی جنبش نہیں آئی۔ ہم اس کے قدموں کی مستی محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم کو خود اپنے محسوسات میں بھی شبہہ ہو سکتا ہے! کیا ہم محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ کی طرح ہمارے دلوں میں ہے، ایک مقصد کی طرح ہماری نگاہوں میں ہے، اور روح کی طرح ہمارے جسم کی ایک ایک رگ میں دوڑ رہی ہے۔

حضرات!

مجھے اجازت دیجیے کہ میں آج آپ سب کی جانب سے ایک ایسا اعلان کروں، جو فی الحقیقت آپکے یقین و احساس کی ترجمانی ہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری جدّوجہد قائم ہے، بدستور جاری ہے؛ اور ہم ایک ایسے وقفہ کی

حالت میں ہیں جس نے فیصلہ کن معرکہ میں التوا ڈال دی ہے، مگر جنگ کے لیے التوا نہیں۔ ہمارے لیے ہشیاری، سرگرمی اور کوشش کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ہم ان سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ التوا یا ناامیدی کا کوئی سوال در پیش ہے۔ لیکن جب میں نے آپ کو اس طرف توجہ دلائی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، تو مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجیے کہ غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے، ہمیں اپنی روزانہ زندگی کی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بیماری کتنی ہی بے حقیقت ہو، لیکن غفلت اور بدپرہیزی سے فوراً مہلک بنا دی جا سکتی ہے۔ آج جو آزمایش ہمیں پیش آئی ہے، فی الواقع یہ ایک عارضی وقفہ ہے، بشرطیکہ ہم اس کو زیادہ بڑھنے نہ دیں۔ ہم ایسا کیونکر کر سکتے ہیں؟ وقت کی مشکلات کا علاج کیا ہے؟ اس سب کا جواب ہم سب کو معلوم ہے، لیکن اس پر عمل دشوار ہو رہا ہے۔ ہم کو صرف اتحاد کی ضرورت ہے اور ہم اسی کی ڈھونڈ میں آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

حضرات!

آج کا یادگار دن اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اس آزمایش سے کامیاب گزر جانے کی نہایت قیمتی مہلت دے۔ ہم نے آج تمام دنیا کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ہماری آزمایش کے نتیجہ کا تماشا کریں۔ کیا ہم اس یادگار دن کا بہترین استعمال کریں گے؟ اس کا جواب ہمیں چند گھنٹوں کے اندر دینا ہے۔

لاتعاون سلمی

حضرات

میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اپنی گزارش کسی ابتدائی سرحد سے شروع کروں۔ ہم نے حصولِ مقصد کے لیے عدمِ تشدد اور ترکِ تعاون کا اصول اختیار کیا ہے۔

نون کوآپریشن کی بنیاد دراصل دنیا کے اس سادہ، مگر عالمگیر اعتقاد پر ہے کہ ہمیں برائی کا ساتھ نہیں دینا چاہیے اور اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ وہ پھول پھل نہ سکے۔

دنیا کے تمام مذہبوں اور اخلاقی تعلیمات کی یہ ایک مشترک سچائی ہے۔ اگر اس اصولی تعریف میں برائی کا لفظ نقصان سے بدل دیا جائے (اور میرے خیال میں دونوں کو مترادف ہی ہونا چاہیے) تو پھر یہ نوعِ انسانی کا نہ صرف عالمگیر اعتقاد بلکہ حیوانی فطرت کا ایک قدرتی رحجان ہوجاتا ہے۔ اور یہاں بھی مذاہب کی صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیرووں کو "ترکِ موالات" کا حکم دیا ہے جس کا منشا یہی ہے کہ جن لوگوں کے کاموں میں تمھارے لیے قومی نقصان ہے، تم کسی طرح ان کی مدد اور مضبوطی کا ذریعہ نہ بنو۔ دوسرے مذہبوں میں بھی ایسی ہی تلقین موجود ہے۔

قوموں کی سیاسی جدّ وجہد کے میدان میں دیکھا جائے، جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے، بلکہ متفقہ عمل ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کو آپریشن کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکی ہے۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جدّ وجہد کرکے حاصل کیے ہیں اور جدّ وجہد مقابلہ اور کشمکش ہے، کوآپریشن نہیں ہے۔

مقاطعہ اور مقاومت سلبی یا سول ڈس او بیڈینیس[^1] بھی جو اس کے سب سے زیادہ قوی ہتھیار ہیں، کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ کمزور افراد اور جماعتیں جب کبھی مسلح مقابلہ سے مجبور ہوئی ہیں، تو انھوں نے اسی طریقہ کو اپنے مقاصد کی حفاظت کا تنہا ذریعہ پایا ہے۔

مذہب، اخلاق اور قومیت کی یہ متفقہ آواز دنیا کی بہت پرانی چیز ہے کہ مصیبت برداشت کرلو، مگر حق سے منھ نہ موڑو۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب اور تعلیم کی ابتدائی کمزوری اور بےبسی میں صرف یہی اصول ثبات و قرار کا ذریعہ ہوا ہے۔ ہم اس کا عکس سقراط کے جامِ زہر میں دیکھتے ہیں، یروشلم کی صلیب پر نقش پاتے ہیں اور مکّہ کی گلیوں میں بھی اس کا غلغلہ سنائی دے چکا ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی دو صدیاں تمامتر اسی کا افسانہ ہیں۔ روم کے قیصر سیویرس کے زمانہ میں جب کہ مسیحی چرچ کی ابتدائی بنیادیں ظلم وستم کے طوفان سے ہل رہی تھیں، یہی اصول تھا جس کی غیر مسخر قوت اُسے تھامے

---

[^1]: (CIVIL DIS-OBEDIENCE)

رہی ۔ اسی عہد کے ایک مسیحی فدا کار ترتولین کی ایک تحریر آج تک محفوظ ہے، جو اس نے رومی عدالتوں کے سامنے بطور اپنے تحریری بیان کے پیش کی تھی ۔ اس کے یہ الفاظ امریکی مصنف ڈریپر کی کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس میں پڑھ سکتے ہیں :

اگرچہ ہماری جماعت کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، لیکن وہ کونسی جگہ ہے، جہاں ہم موجود نہیں۔ شہر، جزیرے، صوبے، قلعے، فوجی بارکیں، دربار کے محلات، سینٹ کے اجلاس غرضکہ ہر اس مقام پر جو تمہارے اقتدار کی علامتیں ہیں، ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز تمہاری عبادتگاہوں کے، ہم نے تمہارے قبضہ میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ غور کرو، اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان بپا ہو جائے۔ لیکن ہمارا مذہب ہم کو سکھاتا ہے کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے۔ اس لیے ہم جھیلتے ہیں، مگر مقابلہ نہیں کرتے

اس سے زیادہ مکمل اور مؤثر اسپرٹ مقاومتِ سلبی کی کیا ہو سکتی ہے؟ ہم چاہیں، تو سترہ سو برس کے ان پرانے لفظوں کو بجنسہٖ آج بھی استعمال کر سکتے ہیں ۔

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی :

البتہ یہ بات کہ سیاسی حقوق کے حصول اور نامنصفانہ حکومت کے ظلموں کو شکست دینے کے لیے اسے بطور دستور العمل کے اختیار کیا جائے اور مسلح انقلاب کی جگہ صرف اسی پر قناعت کر لی جائے، ایک ایسا خیال ہے جو غالباً موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے روس کے سچے مسیحی معلّم کاؤنٹ ٹالسٹائی نے اپنی شہرۂ آفاق تعلیمات میں ظاہر کیا ہے ۔ اور اس قابلِ تعظیم کا دماغ دراصل مغربی تمدّن کی بے روح مادّیت، نظامہائے معاشرت کی بحید ناہمواری، سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی بے روک۔ بے اعتدالی، اور روس کے ارتھوڈکس چرچ کے مذہبی استبداد اور جمود کے برخلاف ایک انتہائی پروٹسٹ تھا ۔ اور اسی انتہائیت کا اثر ہے کہ اس کے انقلابی نظریات کی نسبت ہمیں امریکہ کے

گزشتہ پریذیڈنٹ روزویلٹ کے نکتہ چین لفظوں میں (جو اس نے ایک مرتبہ امریکن اوٹ لک میں لکھے تھے) ماننا پڑتا ہے کہ "وہ بلا کسی جھجک کے عملیت اور اعتدال کی سرحد عبور کر گئی ہیں۔ تاہم اس کی تمام تعلیمات میں یہ تعلیم ایک ایسی معتدل تعلیم ہے جس کی سادہ عملیت بالکل آشکارا ہے اور وہ بلاشبہہ دنیا کو اس کی سب سے بڑی جستجو کا نہایت صاف اور آسان سراغ بتلا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کی تعلیم کی اصلی روح یہ تھی کہ قتلِ انسانی اور جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جو قوتیں انصاف اور انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں ان کا نہ تو اسلحہ سے مقابلہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی طاقت ان کے کارخانوں سے ہے، جو انھوں نے ہر طرف پھیلا رکھے ہیں۔ اگر لوگ اپنی شرکت اور اعانت سے ان کے پھولنے پھلنے کا باعث نہ ہوں، تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ٹک سکتے۔

ٹالسٹائی نے یہ دعوت بےشمار تحریروں میں دی ہے۔ اس کے مضامین کا مجموعہ "سوشل ایول" کے نام سے مرتب ہوا ہے اس میں جا بجا اس کی صدائیں موجود ہیں... ۱۹۰۰ء میں جب انارکسٹوں نے ہمبرٹ شاہ اٹلی کو قتل کیا، تو اس نے ایک پیام تمام ان جماعتوں اور قوموں کے نام شائع کیا، جو حقوق اور انصاف کے لیے انقلاب چاہتے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "ظلم اور استبداد کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسانوں کو قتل کیا جائے۔ یہ تو ایک مرض دور کرنے کے لیے دوسرا مرض لگا لینا ہے۔ حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے اس نظام کی تائید ترک کر دی جائے، جس سے تمام ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ طریقۂ عمل بالکل صاف اور سہل ہے مگر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا! وہ خاتمہ میں خود جواب دیتا ہے: اس لیے کہ حکومتوں نے اپنے قیام و دوام کے لیے نہایت ہوشیاری سے پبلک کو مسحور بنا رکھا ہے۔ وہ اس طرح سوئی ہوئی ہے کہ نہ کچھ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ پس اب ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ حکومتوں کا استبداد دور کرنے کے لیے قتل و خونریزی سے کام لیں، بلکہ چاہیے کہ اس جادو کو توڑ دیں اور لوگوں کو ان کی طلسمی نیند سے بیدار کر دیں۔

مہاتما گاندھی

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اس کے لیے نئی نہیں ہے۔ لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے، وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے، ہر آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے، واشنگٹن جیسے چند آدمیوں ہی کو معلوم تھا۔

پس اگرچہ ٹالسٹائی نے دنیا کو اس اصول کی طرف بلایا، لیکن اس کے قدم ایک دوسری ہی شخصیت کے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس کو قدرت نے خاص اس کام کے لیے چن لیا ہو۔ یہ شخصیت مہاتما گاندھی کے وجود میں نمایاں ہوگئی۔ ٹالسٹائی سے پہلے بھی دنیا کو نون کوآپریشن کی سچائی معلوم تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی سے پہلے اس کی عملی طاقت کا راز اسے معلوم نہ تھا۔

نون کوآپریشن کا پروگرام

ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں نون کوآپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا، اس کے مبادیات اگرچہ وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے، تاہم بہت سی باتوں میں اس سے مختلف بھی ہوگیا ہے۔ پہلے وہ ایک اخلاقی وعظ تھا، اب وہ ایک سیاسی پروگرام ہے۔ ٹالسٹائی کی دعوت میں عقائد اور اصول کی ایسی انتہائی وسعتیں موجود تھیں، جو ایک طرف لوگوں کے موجودہ اوکار و عقائد اور بہت سے نظامہائے عمل سے ٹکراتی تھیں۔ دوسری طرف ان کی عملی دشواریوں پر بھی غالب آنا بہت مشکل تھا۔ لیکن موجودہ شکل نے پوری طرح دامن سمیٹ لیے ہیں۔ اب اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو کسی جماعت کے مذہبی یا سیاسی عقیدہ کو تبدیل کرنا چاہتی ہو، یا ایسی دشواری رکھتی ہو جس کو ایک محدود وقت کے اندر قابو میں نہیں لایا جا سکتا۔ عدم تشدد اس کی اصلی روح ہے۔

لیکن یہ اس امر پر قانع ہے کہ اگر اسے بطور اعتقاد کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا، تو بطور ایک مضبوط پالیسی کے اختیار کر لیا جائے۔ اُن تمام تعلقات کو ترک کر دینا جو ہندستان کے دفتری اقتدار کے قیام کا باعث ہیں، بلاشبہہ اس کا اصل اصول ہے لیکن اس کا دائرہ نفاذ بھی اس نے بہت محدود کر دیا ہے اور جس قدر رکھی ہے اسے طرح سے عمل میں لانا چاہتا ہے کہ اس کی سختیاں کم سے کم صورت میں باقی رہ جائیں۔ ایثار، ضبطِ نفس اور اخلاقی روح کی بلندی اس کی جنگ کے اصلی ہتھیار ہیں۔ تاہم وہ اس بارے میں بھی پوری رواداری برتتا ہے۔ اور بجز ایک مرکزی اور ملک کے لیے نمونہ بننے والی جماعت کے اور کسی سے ایسا مطالبہ نہیں کرتا جس کا پورا کرنا ملک کی عام استعداد کے لیے بہت دشوار ہو۔ موجودہ شکل میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام حقوق طلب جماعتوں کے لیے ایک ایسا سیاسی دستور العمل بن گیا ہے، جو زیادہ سے زیادہ واضح، سادہ اور اس لیے عملی ہو سکتا ہے، اور دنیا کی قوتوں کی غیر مسلح فتحمندی کا یقین دلاتا ہے۔ ان میں نہ صرف اصول کی سچائی ہی ملحوظ ہے، بلکہ عمل کی بھی تمام دشواریوں پر نظر رکھی گئی ہے۔

ترتیبِ عمل :

حضرات!

نون کو آپریشن کے پروگرام کی بعض وضعات کی نسبت ہم میں جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وہ اگرچہ فی الحقیقت صرف اس کے ایک جزدی طریقِ عمل سے تعلق رکھتا تھا، لیکن جب اس نے بحث و مباحثہ کی صورت اختیار کر لی، تو جیسا کہ قاعدہ ہے، طرح طرح کے نئے نئے سوالات پیدا ہو گئے۔ اب سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے، وہ ہمارے موجودہ پروگرام کی نوعیت کا ہے۔ یہ پروگرام ایک مرتبہ عمل میں لایا گیا اور جس قدر نتائج اُس وقت حاصل کر سکتا تھا، اس نے حاصل کیے۔ لیکن جنگ کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے تمام معرکے ابھی باقی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت

میں پروگرام کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسا پروگرام تھا جو صرف ایک ہی مرتبہ عمل میں لایا جاسکتا تھا۔ اگر یہ چل گیا تو چل گیا، نہیں تو پھر کسی دوسرے پروگرام کی جستجو کرنی چاہیے۔ یا یہ اخلاق اور مذہب کی دعوت کی طرح ایک دائمی اور غیر متغیر دعوت ہے، جسے غیر معلوم وقت تک کے لیے ہمیں کہتے رہنا چاہیے اور ہمارا مقصد اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام ملک یا ملک کا غالب حصّہ اس پر پورا پورا عمل کر لیگا، اگرچہ ایسا وقت کتنی ہی مدّت کے بعد آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کر لینا چاہیے۔ میں سوال کے ان دونوں پہلوؤں کا جواب نفی میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ نہ تو اس معنی میں محض ایک ہنگامی اور ایک ہی مرتبہ تجربہ میں آنے والا تھا۔ جو سوال کے ایک پہلو میں نظر آتا ہے؛ اور نہ اس معنی میں دائمی اور غیر تغیّر پذیر، جس کا رجحان دوسرے پہلو میں پایا جاتا ہے۔ دونوں میں دو انتہائی پہلو اختیار کر لیے گئے ہیں اور اصلیّت دونوں کے درمیان ہے۔ اس میں اعتقاد کا استحکام بھی ہے اور دستور العمل کی تغیّر پذیری بھی۔ وہ فرض اور ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

لیکن اس کے صاف صاف فیصلے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ اس پروگرام کے طریقِ عمل کی ترتیب پر غور کر لیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اپنے وہ خیالات آپ کے سامنے رکھ دوں، جو نون کو آپریشن پروگرام کے اوّلین دن سے آج تک بلا تغیّر میرے سامنے رہے ہیں۔ نون کو آپریشن کا پروگرام قبل اس کے کلکتہ کے اسپیشل اجلاس میں منظور ہو کر پوری طرح مرتّب ہو چکا تھا۔ سب سے پہلی مرتبہ جس کمیٹی نے اس پر غور کیا وہ اسی دلّی میں مارچ ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں مہاتما گاندھی کے ہمراہ لالہ لاجپت رائے جی، حکیم اجمل خان صاحب اور میں غور و مشورہ میں شریک تھے۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تاریخ سے لے کر آج تک مجھ پر کوئی وقت ایسا نہیں گذرا ہے، جب مجھے اس کا خیال بھی ہوا ہو کہ یہ اس سوال کے دونوں انتہائی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کا نام ہے۔

پروگرام کی نوعیت :

اس پروگرام کی بنیاد اصل یہ ہے کہ ہم ہندستان کی موجودہ مسلح بیورو کریسی کے مقابلہ میں غیر مسلح اور سلمی (نون وائیلنٹ) جدّوجہد کے ذریعہ ایسی فتحمندی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ہندستانی قوم کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے۔ ہم نے "ہندستان کی مرضی" کو خلافت، پنجاب، اور سوراج سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ہمارا معاملہ ان بہت سے لفظوں میں نہیں، بلکہ اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ ہر ملک کی طرح ہندستان کے لیے بھی آج جس سوال کا فیصلہ درپیش ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کیا قوم کی مرضی کی نمایندہ اس ملک کے باشندوں کی آزاد حکومت ہو گی یا کوئی ایسی حکومت جو فوجی طاقت کے ذریعہ منوائی گئی ہو۔

یہ غیر مسلح جدّوجہد کیونکر عمل میں لائی جائے؟ تو بلاشبہ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیں ایک ایسی بات کی طرف بلاتا ہے جو محض ضرورت اور وقت کا مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مستحکم اعتقاد بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں موجودہ نظام حکومت کی شرکتِ عمل سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہمیں ایسے اقتدار کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، اور اس لیے کہ ہم کنارہ کش ہو کر اسے اس طرح گرا دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلے کے ناقابل ہو جائے۔ اس کا یہ مطالبہ فرض اور ضرورت دونوں پر مشتمل ہے۔ وہ مذہب، اخلاق، تجربہ اور تاریخ سب کی متفقہ صداقت ہے۔ ہمیں اس ناانصافی کے لیے آلہ عمل نہیں بننا چاہیے، جو ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔ اس اعتقاد سے کس انسان کو انکار ہو سکتا ہے! تجربہ اور تاریخ کی قطعی شہادت ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے کسی اجنبی اقتدار سے کوآپریشن کر کے اپنی آزادی حاصل نہیں کی ہے، اور نہ کسی کو یہ متاع بطورِ عطیہ کے ملی ہے۔

یہ حاکمانہ اقتدار کی فطرت ہی کے خلاف ہے، اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے؟

شرکتِ عمل کی یہ علیحدگی اگر بیک وقت پوری طرح عمل میں آجائے، تو کسی عقل کو بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ سورج کے ایک طلوع و غروب کے اندر ہندستان کی

تاریخ پلٹ جاسکتی ہے۔ لیکن کیونکر عمل میں آئے۔ اس آسانی کی ساری دشواری اسی سوال میں پنہاں ہے۔ اس جنگ میں، جو جنگ ہونے کے ساتھ بھی جنگ نہیں ہے، اگر جنگ کی سی کوئی تیاری ہے، تو یہی ہے۔

میں دشواریوں کی تفصیل میں نہ جاؤنگا۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ انہی دشواریوں کا لحاظ رکھ کر اس نے ایسا طریق کار اختیار کیا ہے، جو تمام دشواریوں کو حل کر دیتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی کے لیے کسی ایسے وقت کا انتظار بالکل ضروری نہیں سمجھتا۔ جب ملک کے تمام کوآپریٹر، نون کوآپریٹر ہو جائیں، یا ایک بڑی اکثریت اس کے پروگرام پر عمل کرے۔ بلکہ اس نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے، جس کے لیے صرف ایک خاص مقدار کا عمل کفایت کرتا ہے۔ اگر اتنی مقدار مہیا ہو جائے، تو وہ گو بقیہ کا بھی خواہشمند رہیگا، لیکن اس کے انتظار میں رکیگا نہیں۔

صورت اس کی یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جنگ کے لیے مواد کا مہیا کرنا اور ایک خود جنگ کا۔ معرکۂ جنگ کے سر و سامان کے لیے اسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اُس اسپرٹ کی، جو وہ اپنی غیر مسلح جنگ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ جنگ کے میدان کے لیے اسے ایسے مناسب تصادم کی ضرورت ہے، جو اس کی سلبی (پاز یٹو) قوت اور دفتری اقتدار میں پیدا ہو جائے، اور جو بالآخر ایک فیصلہ کن معرکہ کی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پہلی غرض کے لیے اس نے وہ پروگرام اختیار کیا ہے، جس میں وہ سرکاری درباروں، تعلیمگاہوں اور عدالتوں سے نان کوآپریشن کی دعوت دیتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ کوآپریشن کی انہی بستیوں میں کئی ایسے آدمی موجود ہیں جو دفتری اقتدار اور قومی جدّوجہد کے لیے بہترین سپاہی ہو سکتے ہیں۔ پس وہ ان کو بلاتا ہے۔ تاکہ ایک طرف حریف کے قبضہ سے اس کی بہترین فوج نکل سکے، دوسری طرف اس کی جنگ کے لیے بہترین سپاہی مہیا ہو جائیں۔ جب اس دعوت کے ذریعہ ایک تعداد فراہم ہو گئی، تو گویا اس نے اپنی پہلی فوج تیار کر لی۔ اب یہی فوج اس کی تمام جد وجہد کے لیے اصلی اور مرکزی

فوج ہے۔ اس کی تمام آیندہ اُمیدیں مُلک سے نہیں، بلکہ اسی جماعت سے وابستہ ہیں۔ یہ پہلی فوج ایک طرف بلا انتظار جنگ شروع کر دیگی۔ دوسری طرف اپنی دعوت اور عملی نمونہ کی تاثیر سے وقتاً فوقتاً نئی نئی جماعتوں کو بھی اپنے میں جذب کرتی جائیگی۔

دوسری غرض کے لیے اس نے مقاومتِ سلبی یا سول ڈس اوبیڈ ینس کا پروگرام اختیار کیا ہے۔ یہی اس کی اصلی جنگ ہے، اور اسی پر اس کے مقصد کا فیصلہ موقوف ہے۔

پس اس طریقِ عمل نے اس سوال کو بالکل غیر ضروری کر دیا ہے کہ تمام ملک نون کوآپریشن پر ایک معیّن وقت کے اندر عمل کر سکیگا یا نہیں؟ اور اگر ایک بڑی تعداد اس پر عمل کر کے عدالتوں اور کالجوں سے نکل بھی آئی، تو ہم اسے اپنی جاری جنگ کے ہر وقت میں یکساں استقامت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ سکینگے یا نہیں؟ اگر تمام ملک عمل نہیں کر سکتا، تو نہ کرے۔ اگر بہت سے لوگ اس پر عمل کر کے قائم نہیں رہ سکتے، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نون کوآپریٹر کو اس پر افسوس ہوگا، مگر ہراس نہ ہوگا۔ بلاشبہہ وہ بطور ایک اعتقاد اور فرض کے سب کو بلاتا ہے۔ لیکن بطور ایک جدّوجہد کے پروگرام کے وہ کسی ایسی مکمّل اور یکساں حالت کا بالکل محتاج نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے بیخبر نہیں ہے کہ جماعت کے اعمال، عقل و استدلال کے تابع نہیں ہیں، تمامتر جذبات کی مخلوق ہیں۔ جماعت یا تو دوڑتی ہے، یا بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ پس یہ ناگزیر ہے کہ اُتار چڑھاؤ ہوتے رہیں۔ جب کبھی ایک خاص طرح کی فضا پیدا ہو جائیگی، ایک اشارے پر ہزاروں قدم دوڑتے آئینگے۔ پھر جب وہ بدلیگی تو بار بار کے بلاوے پر بھی ایک قدم جنبش نہ کریگا۔

ایک فضا کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ صرف جنگ سے۔ اس کی جنگ سول ڈس اوبیڈینس ہے۔ پس اگر وہ کسی بات کے لیے فکرمند ہے، تو وہ صرف اس کی پہلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کے میدان کی فتح و شکست کا دار و مدار اس کی اخلاقی فتح و شکست پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پہلی فوج خواہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو، لیکن اپنے اندر کمیّت کی نہیں، بلکہ کیفیت کی طاقت پیدا کرلے۔ وہ نون کوآپریشن کا اپنے آپ کو مجسّم عملی نمونہ بنالے۔ پہاڑ کی

طرح اٹل اور سمندر کی طرح لبریز ہو جائے۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتی جائے اور عملی نمونہ کی کشش اور گیرائی سے ملک کی غفلت اور اعراض کو شکست دے دے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر ایسی جماعت ملک میں قائم ہو گئی، اور اس نے اپنی جنگ جاری رکھی تو یہ اس طرح کی کشمکش کے نفسیات کا قانون ہے کہ بہت جلد جنگ کے معرکوں کا موقع حاصل ہو جائیگا۔ اور جونہی ایسے معرکوں کی فضا پیدا ہوئی، پھر خود بخود ہزاروں لاکھوں قدم اُس طرف بن بلائے دوڑینگے، اس کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں رہیگی۔

اگر پہلے مقابلہ میں وہ نتیجہ حاصل نہ کر سکی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوگی کہ اب سپاہی اپنے بستروں پر واپس جا چکے ہیں۔ وہ اپنا کام جاری رکھیگی اور اس وقفہ کو اس طرح خرچ کریگی، تاکہ جلد از جلد دوسرے مقابلہ کے لیے فضا مہیّا ہو جائے۔ پھر جب ایسی فضا پیدا ہو جائیگی، وہ مقابلہ کا اعلان کر دیگی۔ اور اس کو یقین ہے کہ وہ سب جو بستروں پر لیٹ چکے ہیں، اچانک میدان میں کھڑے نظر آئینگے۔

البتہ اس کا پروگرام بالطبع ایک محدود وقت کے اندر نتیجہ حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ لمبے لمبے وقفوں کا نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اندازہ کیا تھا کہ پہلے مقابلہ کا نتیجہ سال بھر کے اندر نکل آنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ترتیب عمل کے واضح ہو جانے کے بعد اب اس سوال کا جواب خود بخود مل جاتا ہے، جو موجودہ مباحثہ نے پیدا کر دیا ہے۔ سوال کے دونوں پہلو اصلیت سے منحرف ہیں۔ نہ تو یہ پروگرام کوئی ایسا پروگرام تھا، جو صرف ایک مرتبہ عمل میں لا کر ترک کر دیا جائے۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ نتائج اور حالات سے بالکل آنکھیں بند کر کے محض ایک اخلاقی اصول کی طرح اس کا وعظ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا نصف حصّہ، خود جنگ نہیں ہے، بلکہ جنگ کے لیے سپاہیوں کی طلب ہے۔ اور وہ ہمیں اس طرح بار بار کام دیگا، جس طرح بار بار ہم فیصلہ کن معرکے گرم کرینگے۔ بقیہ نصف، اصل جنگ کا میدان مہیّا کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی مرتبہ فیصلہ کن ہو۔

نون کوآپریشن کی ذہنیت (مینٹلٹی):

یہاں سے یہ بات بھی ضمناً واضح ہوگئی کہ نون کوآپریشن کی ذہنیت کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، وہ کس قدر دُور از کار ہیں! کہا گیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و علوم کے برخلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ سیاسی جدّ وجہد کی جگہ ایک نئے مذہب اور اخلاق کا وعظ ہے۔ وہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی تعلیم دے کر دنیا میں تقدّم کی جگہ واپسی کی خواہش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ ہمارے خیالات کی ایسی تعبیر ہے، جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔

دراصل تمدّن، تعلیم اور معیشت کے سوالوں سے اسے براہِ راست کوئی تعلّق ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہندستان میں مغربی تہذیب و تمدّن کے محاسن اور نقائص کی نسبت مختلف قسم کی رائیں موجود ہیں۔ خود یورپ اور امریکہ کا ذہنی سکون جنبش میں آچکا ہے۔ اور نئے نئے اصولوں اور خیالات کے سیلاب امنڈ آئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح خود مہاتما گاندھی کے بھی اس بارے میں خاص خیالات ہیں، لیکن نان کوآپریشن اپنے مقصد کے سوا اور کوئی رائے نہیں رکھتا۔ وہ اپنے پیرودں کو نہ تو کوئی مذہبی اعتقاد سکھاتا ہے، نہ ترکِ دنیا اور زہد و عبادت کی ایک نئی خانقاہ تعمیر کرنی چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح ایک سیاسی دستورالعمل ہے، جس کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہے۔ اس لیے مذہب، اخلاق، تاریخ سب کی نگاہیں یکساں طور پر اسے پہچانتی ہیں اور اپنی اپنی زبان میں پکارتی ہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ سرکاری تعلیمگاہیں اور قانون کی پریکٹس چھوڑ دو، تو اس لیے نہیں کہ وہ یورپین علوم اور قانون کی پریکٹس کا مخالف ہے۔ بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اس اقتدار کا مخالف ہے، جس کے ماتحت وہاں رہنا اور اس کی اعانت کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ کھدر پہن لو، تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ قیمتی لباس یا کسی خاص وضع قطع کا مخالف ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ وہ غیر ملکی لباس پر ملکی لباس کو ترجیح دیتا ہے، اور نیز اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ملک کو اپنی آزادی اور نجات کے لیے طرزِ معیشت کی سادگی اور ضبطِ نفس

کی اخلاقی روح کی ضرورت ہے۔

پہلا تجربہ:

آیئے اب غور کریں۔ ہماری موجودہ حالت کیا ہے؟ ہم نے پروگرام کے پہلے حصّے کے مطابق لوگوں کو بلایا۔ وہ آئے اور ایک پہلی اور مرکزی جماعت نبیاد ہوگئی، پھر اس کے دوسرے حصّہ کے مطابق حالات نے جلد تصادم کی فضا بھی مہیّا کر دی اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۱ء کی بات ہے، اب نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے کہ یہ پروگرام کہاں تک کامیاب ہوا؟ لیکن کامیابی کی جانچ کا ٹھیک معیار کیا ہے؟ دو چیزیں ہیں۔ دونوں کی کامیابی کا ایک معیار نہیں ہو سکتا۔ ایک نان کوآپریشن کا دستور العمل ہے۔ ایک ہماری وہ جدّوجہد ہے، جو اس پر عمل پیرا ہو کر ہم نے حاصل کی ہے۔ اگر ہم اپنی جدّوجہد میں آخری مقصد حاصل نہ کر سکے، تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی ذمّہ داری دستور العمل کے سر عائد ہو۔ بحیثیت ایک عملی پروگرام کے اس کی کامیابی یہ ہے کہ تجربہ سے اس کے قابلِ عمل، موثر اور نتیجہ خیز ہونے کی شہادت مل جائے، اگر ایسی شہادت مل جائے، تو پھر اس کی کامیابی کے لیے کوئی بات نہیں رہ جاتی؛ اگرچہ ہمارے لیے کامیاب ہونا باقی رہ جاتا ہے۔

باقی رہی ہماری جدّوجہد کی کامیابی، تو مجھے اس سے بھی انکار ہے کہ اس کے لیے آخری مقصود کا پا لینا معیار ہو سکتا ہے۔ آخری مقصود کا پا لینا صرف کامیابی ہی نہیں ہے، بلکہ آخری کامیابی ہے، اور ضروری ہے کہ اس سے پہلے متعدد کامیابیاں حاصل کر لی جائیں، ہمیں دیکھنا یہ چاہیے، کہ وہ کامیابی ہم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

تجربہ کی کامیابی

حضرات!

میں بلا کسی تامّل کے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے یقین میں یہ پروگرام کامیاب ہوا بلکہ اس نے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے، جو کسی ایسے پروگرام کے لیے ہو سکتی ہے۔

اگر اب سے تین برس پہلے وہ ایک اصول تھا، جس کی کامیابی استدلال سے واضح تھی، تو اب ایک تجربہ میں آیا ہوا یقین ہے، جس کی کامیابی مشاہدہ نے ثابت کر دی ہے۔
ایک منٹ کے لیے ان تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کو اپنے سامنے لائیے، جو اس کی راہ میں حائل تھیں۔ اس تھوڑے سے وقت کا بھی خیال کیجیے جو اس کو تعلیم، تیاری اور عمل تینوں منزلیں طے کرنے کے لیے ملا۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ راہِ آزادی میں یہ ملک کا پہلا عملی قدم تھا۔ پھر دیکھیے کہ کیسے حیرت انگیز نتائج کا کیسا عظیم سلسلہ آپ کے سامنے موجود ہے؟ کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس کی ناکامی کا خیال بھی کر سکیں؟ اس کی کونسی بات ہے جس پر عمل نہ ہو سکا اور کونسا عمل ہے جس نے کامیاب اثر نہیں دکھایا؟ کیا ہزاروں آدمیوں نے سرکاری انسٹی ٹیوشنوں کو نہیں چھوڑا؟ کیا وہ اُن تمام دنیوی فائدوں اور راحتوں سے دستبردار نہیں ہو گئے، جو انھیں حاصل ہو رہی تھیں؟ کیا تمام ملک میں ایثار اور قربانی کا عام ولولہ نہیں پیدا ہو گیا؟ کیا ہزاروں آدمی خوشی خوشی جیل خانوں میں نہیں چلے گئے؟ کیا حکومت کا پورا اسلحی نظام اس سے عاجز نہیں آ گیا کہ پرنس آف ویلز کے ورود کے موقع پر ہڑتال کی ایک دوکان کا تختہ بھی نہ کھلوا سکے؟ کیا ۱۹۲۱ء کی ہر صبح اور شام نے اس کی شہادت نہیں دے دی، کہ ہندستان میں بھی قوم کی مرضی ہے، اور وہ میدان میں نمایاں ہو سکتی اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہو سکتی ہے۔
قوموں کا انقلاب پہلے سطح پر نہیں، بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے بارہ مہینے کے اندر ہندستان کا دماغ پلٹ دیا۔ قوم کے تمام طبقوں اور جماعتوں کی استعداد دفعتہً بلند کر دی۔ برِ اعظم کے ایک ایک فرد تک آزادی اور وطن پرستی کا پیغام پہنچا دیا۔ ہزاروں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب طاری کر دیے۔ راہِ آزادی کی سزاؤں اور تکلیفوں کا خوف ملک کے دل سے اس طرح نکال دیا کہ قید ہونا کھیل اور سزا دینے والی عدالتیں تماشا گاہ بن گئیں۔ غرضکہ آزادی کی جد و جہد کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا دروازہ اس نے ملک میں کھول دیا ہو۔ اگر یہ تمام باتیں کل تک کے واقعات ہیں، تو پھر اس بات کے لیے اور کیا چاہیے کہ پروگرام صحیح ہے، عملی ہے، اور اپنی تاثیر میں یکتا

ہے۔ نون کوآپریشن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ قدیم روایتوں کے معجزے دکھلائیگا۔ اس کا عاجزانہ اعلان یہ تھا کہ اس پر چل کر ملک بلا اسلحہ کے ایسی طاقت پیدا کر سکتا ہے، جو دفتری اقتدار کے لیے ناقابلِ تسخیر ہوگی۔ پھر کیا یہ تمام نتائج اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

پہلا معرکہ:

اگر سوال کیا جائے کہ ہماری جدّوجہد میدانِ جنگ میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکی؟ تو اس کے جواب کے لیے ہمیں دسمبر ۱۹۲۱ء کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جب دفتری اقتدار نے کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ نافذ کر کے ڈیفنس سول ڈس اوبیڈینس کی راہ صاف کر دی تھی۔ فی الحقیقت یہی جدّوجہد کا اصلی معرکہ تھا۔ میں اس کی تاریخ کا یہ واقعہ یہاں ثبت کرتا ہوں کہ ۲ دسمبر کو مقابلہ شروع ہوا اور ابھی دو ہفتے پورے نہیں گذرے تھے کہ دفتری اقتدار پر شکست کے آثار طاری ہو گئے، حتیٰ کہ اسے مجبوراً جدّوجہد کی طاقت کا کھلا اعتراف کرنا پڑا۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ التوائے جنگ یا صلح کے لیے آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ بالکل تیار تھا کہ جدّوجہد سے ایک مقابل حریف کی طرح معاملت کرے، دونوں میں سے کسی فریق کی ہار جیت کا سوال نہ ہو، دونوں عارضی طور پر اپنی اپنی کارروائیوں کو ملتوی کر دیں، گورنمنٹ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کا نفاذ اٹھالے اور قیدیوں کو رہا کر دے۔ کانگریس پرنس آف ویلز کے ورود کا مقاطعہ ملتوی کر دے۔ اس کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو اور وہ جدّوجہد کے مطالبات پر غور کرے۔ ہزایکسیلینسی وائسرائے نے ۲۱ دسمبر کو کلکتہ میں ایک وفد کا جواب دیتے ہوئے انہی شرائط پر زور دیا تھا اور بار بار طلب و تمنّا اور صلح و صفائی کے لیے ایسے لب و لہجہ میں، جس کا دفتری اقتدار کبھی عادی نہیں ہوا، اپنی انتہائی خواہش ظاہر کی تھی کہ التوا اور صلح کی صورت نکل آئے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ میں اسے جدّوجہد کی کوئی بہت بڑی فتحمندی سمجھتا ہوں۔ ہمارا مقصد بلند ہے اور ضروری ہے کہ اسی مناسبت سے ہماری کامیابی کا معیار بھی بلند ہو۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی چیز نہیں ہے کہ ہم سے صلح کی ایک ایسی خواہش

پیدا ہوئی، جس کے ساتھ کوئی وعدہ نہ تھا۔ البتہ میں اسے جدّوجہد کی ابتدائی کامیابی ضرور یقین کرتا ہوں۔ اس نے دکھا دیا کہ ہمارا طریقِ عمل کسی قدر زود اثر اور بے خطا ہے اور کس طرح وہ دو ہفتہ کے اندر اغماض اور گھمنڈ کی جگہ اعتراف اور طلب کی تبدیلی پیدا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

انقلابِ حال اور جدّوجہد کے لیے وقفہ:

حضرات!

ہر قومی جدّوجہد کی تاریخ میں جہاں اس کی بہت سی باتیں یادگار ہوتی ہیں، وہیں چند غلطیوں کا بھی ذکر ضرور ملتا ہے۔ ان غلطیوں کا ہونا گویا اس طرح کی حالت کی ایک قدرتی بات ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ بار دولی کا فیصلہ ہماری جدّوجہد کے لیے ایک ایسی ہی غلطی تھی۔ ہم اس پر اپنے تاسف کو تو نہیں روک سکتے، لیکن ہم اسے اس طرح محسوس کرتے ہیں۔ گویا ایک ہونے والی بات تھی۔ اس سے ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے تھے۔ دراصل باردولی کے فیصلہ پر ہماری جدّوجہد کا پہلا فیصلہ کُن معرکہ ختم ہو گیا اور اس وقت سے ہم ایک ایسے وقفۂ جنگ کی حالت میں ہیں جس میں جنگ تو قائم ہے، لیکن مقابلہ کے لیے وقفہ پیدا ہو گیا ہے۔

کونسل کا اختلاف:

حضرات!

گزشتہ جنوری میں جب میں جیل سے رہا ہوا، تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری خدمت یہ ہے کہ اس اختلاف کے دُور کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ذاتی خیالات ظاہر کر کے کوئی خاص جانب اختیار کرنے سے پرہیز کروں، اس لیے مجھے اس وقت تک کوئی موقع نہیں ملا کہ اصلی مسئلہ کی نسبت اپنی ناچیز رائے ظاہر کرتا۔ آج یہ پہلا موقع ہے کہ اس بارے میں زبان کھولتا ہوں۔ اس اختلاف نے دو جماعتیں قائم کر دی ہیں، ان دونوں میں، میرے ایسے محترم احباب موجود ہیں، جن کی قابلیت،

اور خدمت کی میرے دل میں ویسی ہی عزت ہے جیسی ہر باشندۂ ہند کے دل میں ہونی چاہیے۔ تاہم یہ بات اس سے مانع نہیں ہو سکتی۔ کہ میں اپنے خیالات صاف صاف عرض کردوں کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں، تو علاوہ ادائے فرض کی کوتاہی کے یہ اُس اعتماد کا بھی صحیح استعمال نہ ہوگا، جو آج آپ نے مجھ پر ظاہر فرمایا ہے۔

سب سے پہلی بات جو اس اختلاف کی نسبت میں عرض کرونگا، وہ یہ ہے کہ اوّل روز سے جس قدر اہمیت اس مسئلے کو فریقین کی جانب سے دی گئی ہے، مجھے کلیۃً اس سے اختلاف ہے میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ دراصل ہماری تمام موجودہ مشکلات کی اصل بنیاد اسی غلطی میں پنہاں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کبھی کوئی اختلاف رائے پیدا ہو، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دیکھیں یہ اصول کا اختلاف ہے یا فرع کا؛ اس کا اثر کسی جڑ پر پڑتا ہے یا محض شاخ پر۔ اگر وہ اختلاف اصول کا اختلاف ہے، تو بلاشبہہ ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ثبات و استقامت اس میں ظاہر کریں؛ نرمی اور درگزری کی اس میں کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ کثرت و قلت رائے کا سوال اس کے لیے خارج از بحث ہے۔ ڈسپلن کا سوال بھی اس پر موثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ محض ایک شاخ کا اختلاف ہے، تو پھر صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنی رائے میں کمزور ہونے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن عمل میں اتنا سخت نہ ہونا چاہیے کہ کسی طرح کی لچک قبول نہ کریں۔ ضرورت ہوگی تو ہم اس سے قطع نظر بھی کر لینگے، کوئی بڑی مصلحت سامنے آجائیگی، تو اس چھوٹی چیز کو اس پر قربان بھی کر دینگے، جماعت کا ساتھ، مجارٹی کا اتباع، نظام کا ڈسپلن، سب اس سے اوپر رہینگے، اس کے لیے چھوڑ نہیں دیے جائینگے۔ عزم اور ثبات یقیناً انسان کے لیے اوّل درجہ کے اوصاف ہیں، مگر اسی حال میں جب کہ اپنے صحیح محل پر خرچ کیے جائیں اور صحیح تعداد میں خرچ کیے جائیں۔ میں بلا کسی تامل کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کا اختلاف نون کوآپریشن کے لیے قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ نون کوآپریشن بحیثیت ایک اصول کے کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی شخص اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پروگرام کی دفعات

ہیں، جن میں کالج، عدالت اور کونسلوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ یقیناً وہ سرکاری کالجوں کو چھوڑ دینے، یا کونسلوں کے ووٹروں کو ووٹ دینے سے روکنے ہی کا نام نہیں ہے۔ وہ ان سب سے بالاتر کوئی چیز ہے اور وہی نان کوآپریشن ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ اختلاف نون کوآپریشن میں نہ تھا۔ اس بارے میں نہ تھا کہ ہمیں کونسلوں میں اشتراکِ عمل کے لیے جانا چاہیے یا نہیں؟ صرف یہ تھا کہ ہمیں اصلاحی کونسلوں کے دوسرے انتخاب کے موقع پر بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جو پچھلی دفعہ اختیار کیا تھا، یا اس میں تبدیلی کرنی چاہیے؟ میں بالکل یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ نون کوآپریشن کی مضبوط سے مضبوط پابندی کے ساتھ کیوں اس بارے میں دو رایوں کی گنجایش نہیں ہے؟ یہ تو صرف پروگرام کی تبدیلی کا سوال بھی نون کوآپریشن کے لیے ایک اصولی سوال سمجھا جائے۔ نون کوآپریشن کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم موجودہ دفتری اقتدار سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ پس، جب ایک شخص نے اس سے اتفاق کیا تو وہ نون کوآپریٹر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرح یہ بات بطور ایک قومی حرکت کے عمل میں لائی جائے؟ تو اس کے لیے جو کچھ بھی ہم طے کریںگے، وہ ضرور واجب العمل ہوگا۔ لیکن بہرحال اصل نہیں ہے، فرع ہے، مقصود نہیں ہے، وسیلہ ہے اور اگر اس میں اختلاف رائے ہو، تو وہ کبھی اس اہمیت کا مستحق نہیں ہو سکتا، جو اصولی اختلاف کو دی جا سکتی ہے۔

آزادی ہمارا مقصد ہے۔ عدمِ تشدّد اور نون کوآپریشن ہمارا اصول ہے اور حصولِ مقصد کے لیے ہم نے ایک پروگرام اختیار کیا ہے جس کی ہر دفعہ ایک وسیلہ ہے، مقصد ہے۔ ہم اعتقاد نہیں بدل سکتے۔ ہم اصول نہیں ترک کر سکتے۔ لیکن ہم وسائل میں ہر آن اور ہر لحظہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی سے ہمیں انکار ہوگا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ سے انکار کر دیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایسی اہمیت فریقین میں حاصل کر لی، گویا یہ ایک اصولی اختلاف ہے اور دونوں طرف سے اس قدر قوت خرچ کی گئی، گویا قومی جدّ و جہد کا جینا مرنا اس پر موقوف ہے۔ ایک طرف سے کہا گیا کہ یہ خود نان کوآپریشن کا اختلاف ہے، حالانکہ اگر نان کوآپریشن کا اصول اس قدر تنگ مان لیا جائے، تو پھر میں نہایت ادب سے عرض

کرونگا کہ دنیا میں نون کو آپریشن کا کوئی عمل چند دنوں سے زیادہ نہیں جی سکتا۔ دوسری طرف سے اس بات پر اس قدر زور دیا گیا کہ اس کی وجہ سے کانگریس کی متحدہ قوت کا تفرقہ گوارا کر لیا جائے۔ حال آنکہ اگر اس طرح کے جزوی اختلاف کی بنا پر تفریق اور جماعت بندی درست کر لی جائے، تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

بہر حال جو اہمیت اس معاملہ کو دی گئی، مجھے اس سے اختلاف ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہ تھا جس کی خاطر ہم اپنا اتحاد، اپنی سرگرمی، اور اپنا وہ سب کچھ جو ہم نے حاصل کیا ہے، خطرہ میں ڈال دیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ گیا کانگریس میں آپنے خواہ یہ فیصلہ کیا ہوتا، لیکن اگر آپ متفق رہتے، تو آج ان مشکلات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا، جن کی وجہ سے جدوجہد کا ایسا قیمتی برس جیسا کہ ۱۹۲۳ء ہے، بالکل ضائع ہو گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے فتور کا بھی اصلی باعث کیا ہے؟ میں عرض کرونگا، صرف آپ کا یہ اختلاف اور اختلاف کی وجہ سے ملک کی بیکاری۔ لوگوں کے لیے جب وہ اصلی کام باقی نہ رہا، جس میں سب کے دل اٹک گئے تھے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپس میں ٹکرانے لگیں۔ آپ جب کہ طریق عمل کی ایک خاص صورت کے لیے اس قدر طاقت خرچ کر رہے ہیں، تو ایک لمحہ کے لیے اس حقیقت کو بھی یاد کر لیجیے کہ کامیابی کا دارومدار محض ہتھیاروں اور راستوں کی نوعیت پر نہیں ہے، بلکہ خود فوج کی طاقت پر ہے۔ یہ بات کہ ہتھیار کیسے ہوں؟ ایک دوسرے درجہ کا سوال ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ سپاہی کیسے ہوں؟ اور ان کی اخلاقی حالت کیسی ہو؟ ہتھیار کے لیے صرف اتنا دیکھ لینا بس کرتا ہے کہ کاٹ رکھتا ہو۔ اگر وہ بہتر قسم کا نہیں ہے، تو مضائقہ نہیں۔ فوج میں ایکا اور مضبوطی ہونی چاہیے۔ ایک متحدہ فوج خراب ہتھیاروں کے ساتھ بھی کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن اچھے سے اچھے ہتھیار بھی منتشر اور بے دل سپاہیوں کو جیت نہیں دلا سکتے۔ ہم سب ایک برس سے صرف اتنی بات پر لڑ رہے ہیں کہ ہتھیار کیسا ہو؟ لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ آج فوج کا کیا حال ہو رہا ہے۔ اگر فوج ہی منتشر ہو گئی، تو پھر آپ کو اچھی سے اچھی بندوق بھی کیا کام دیگی؟ مان لیجیے کہ

کونسلوں کا بائیکاٹ ہی سب سے بڑا کام ہے، یا کونسلوں پر قبضہ کر لینے میں دنیا جہان کی فتح ہے۔ تاہم جب آپ کی متحدہ طاقت نہ رہی، آپ کا نظام الٹ گیا، کسی قومی مرکز کا ڈسپلن قائم نہ رہا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد میں رخنے پڑ گئے، تو فرمایئے، آپ بائیکاٹ کیونکر کریں گے؟ کونسلوں کی نشستوں پر کیونکر قابو پائیں گے۔

افراط و تفریط:

حضرات!

ہمارے سامنے محافظت کی اصلی چیز جزئیات نہیں ہیں، اصول ہیں۔ پس یہ کسی طرح صحیح طرزِ عمل نہ ہوگا کہ ہم کسی جزوی مسئلہ کے جوش میں اس قدر دور چلے جائیں کہ اس کی وجہ سے نئے نئے اصولوں کے قائم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور وہ آگے چل کر ہمارے لیے اصولی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس اختلاف نے جب دو جماعتیں قائم کر کے فریقانہ بحث و نزاع کی شکل اختیار کر لی، تو یہ ناگزیر تھا کہ افراط و تفریط کی طرف میلان پیدا ہو۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے اپنے دل و دماغ کی نگہبانی کریں۔ ہمیں کبھی کورانہ تقلید کی دعوت نہیں دینی چاہیے، لیکن ہمیں ہمیشہ اطاعت (ڈسپلن) میں مضبوط رہنا چاہیے۔ تقلید سے مقصود ایسی دماغی حالت ہے جب کہ انسان کسی بڑے آدمی کی پیروی کرتا ہوا حدِ اعتدال سے گزر جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنے ذہن و دماغ سے کام لے، محض ایک شخص کا قول اس کے لیے حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار بن جاتا ہے۔ مذہب اور علم، دونوں کے راستہ میں اس طرح کی تقلید انسانی ترقی و سعادت کے لیے سب سے بڑی روک ثابت ہوئی ہے۔ اور ہمیں کبھی نہیں چاہیے کہ سیاست کو بھی اس سے آشنا کریں۔ برخلاف اس کے اطاعت سے مقصود ایسی پیروی ہے، جو ایک سپاہی اپنے کمانڈر کی کرتا ہے۔ جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی و کامیابی کے لیے روک ہے، اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے۔ ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو۔ لیکن سپاہی اس کے خلاف رائے رکھ سکتا ہے، مگر اس کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔

اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو، جب بھی ہمیں چاہیے کہ سباسٹوپول کی اس انگریز رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے، کٹ جائیں، لیکن اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت ہو جائے۔

آج انڈین نیشنل کانگریس ہماری تنہا حکمران جماعت ہے۔ ہم جنگ کی سی حالت میں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ خواہ کانگریس کا فیصلہ ہو، یا ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کی رائے ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے، لیکن ساتھ ہی ہمیں اطاعت سے باہر بھی نہ ہونا چاہیے۔ جو جماعت تبدیلی کی مخالف ہے، وہ اس میں احتیاط نہیں کرتی کہ کہیں تقلید وجمود کی طرف قدم نہ بڑھ جائیں۔ اور جو جماعت تبدیلی پر مصر ہے، وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتی کہ ایک جزوی اختلاف کی وجہ سے ہمیں اپنے نظام کے ڈسپلن سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

ہمارا آیندہ پروگرام

حضرات!

مجھے اب اجازت دیجیے کہ میں موجودہ حالات اور آیندہ طریق عمل کی نسبت اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میرا یقین ہے کہ ہندستان کے لیے مہاتما گاندھی کی رہنمائی ایک تسحی رہنمائی ہے اور اگر ہندستان آزادی اور نجات حاصل کر سکتا ہے، تو صرف ان ہی کی رہنمائی سے۔ ہندستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں: یا موجودہ حالت پر قانع رہے، یا مسلح انقلاب کرے، یا نون کوآپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالت پر قانع نہیں ہو سکتے ہم مسلح انقلاب نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے صرف تیسری راہ رہ جاتی ہے اور وہ نون کوآپریشن ہے۔

باقی رہا اس کا پروگرام، تو اس وقت تک کوئی بات ہمارے سامنے نہیں آئی ہے، جس کی وجہ سے کسی اصولی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ البتہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہمارا پہلا مقابلہ ہو چکا۔ ہم اس وقت ایک وقفۂ جنگ کی حالت میں ہیں اور ہمیں آیندہ مقابلہ

کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ہمارا فیصلہ کن مقابلہ بجز سول ڈس اُو بیڈ نیس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس سول ڈِس اُو بیڈ بنیس سے بالفعل قطع نظر بھی کر لیں، جب بھی ڈیفنس سول ڈِس او بیڈ نیس کی طاقت پر پورا اعتماد ہے۔

البتہ اس کے لیے ایسے حالات کی ضرورت ہے، جن میں بعض تو ہماری تیاریوں سے تعلق رکھتے ہیں، بعض کا تعلق تمام تر دفتری اقتدار کے طریق عمل سے ہے۔ ایک خاص طرح کا طریق عمل وہ اختیار کرے، جب کہیں وہ صورت پیدا ہو سکتی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔ مثلاً وہ جبر و تشدد کے ذریعہ ہماری سرگرمیوں کو روکے، یا قوانین کا غلط استعمال کرے، جیسا کہ پچھلے موقعوں پر اس نے کیا تھا۔ بلاشبہہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی مطمئن رہنا چاہیے کہ موجودہ حالات کے قدرتی قوانین ہمارے حق میں ہیں۔ ہمیں صرف یہی معلوم نہیں ہے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں، بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا مقابل فریق گمراہ ہے۔ اور یہ ایسے مقابلہ کی طبیعت ہے کہ گمراہ حریف کو ٹھوکریں لگیں۔ ہندستان میں آج دفتری اقتدار کے افراد اور ہندستانیوں کے دماغ کا مقابلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک غلط نظام اور صحیح مطالبہ میں مقابلہ ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اُس سے غلطیوں پر غلطیاں ہوں اور ضروری ہے کہ قومی جدّ و جہد نئی نئی طاقتیں اور مہلتیں حاصل کرے۔ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے اپنی تیاریاں قائم رکھیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ایسی فضا پھر پیدا ہو جائیگی کہ ہم اپنا دوسرا فیصلہ کن معرکہ شروع کر سکینگے۔ جونہی معرکہ شروع ہوگا، پھر از سر نو سپاہیوں کے لیے کشش پیدا ہو جائیگی۔ ہم دیکھ لینگے کہ بستر خالی ہو گئے ہیں، اور میدان پھر سے بھر رہا ہے۔

کونسلوں کا مقابلہ:

لیکن یہ وقفہ کیونکر اس طرح بسر کیا جائے کہ جلد سے جلد مقابلہ کے لیے مناسب فضا مہیا ہو جائے؟ اور ساتھ ہی ہماری موجودہ مشغولیت کے لیے بھی مفید ہو؟ اس وقفہ کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ہم موجودہ انتخاب کا بائیکاٹ کریں۔ یا یہ کہ جہاں کہیں اکثریت کے ساتھ کونسلوں میں جا سکتے ہیں، جائیں، اور انھیں بھی نون کو آپریشن کی سرگرمیوں کا ایک عارضی گوشہ بنا لیں۔

حضرات!

حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جو رائے قائم کر سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح گزشتہ انتخاب کے موقعہ پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا، اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ہم نشستوں پر قبضہ کر لیں۔ اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں جائیں اور ایسا طرزِ عمل اختیار کریں کہ یہ مقامات بھی ہماری جدّوجہد کا ایک گوشہ بن جائیں۔

میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے، دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو، یہ بات قطعی طور پر طے کر دی جائے کہ کونسلوں میں جانا ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت ہے، جو کانگریس قرار دے۔ اس پروگرام میں صاف طور پر وہ تمام باتیں موجود ہیں، جو ہمارے طرزِ عمل کو شرکتِ عمل کی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ یہ قطعی ہے کہ وہاں جاکر کوئی زیادہ مدّت تک کا کام نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہمارا مقصود کسی حال میں بھی شرکتِ عمل نہیں ہے، اگرچہ بظاہر اچھے کاموں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی بالکل صاف کر دینی چاہیے کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی مدّت کے لیے بھی وہاں کسی عہدہ کی ذمّہ داری نہیں لی جا سکتی، خواہ کسی نیت و مقصد سے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کونسلوں میں جاکر کیا طرزِ عمل اختیار کریں، تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اور بہت کچھ یہ وقت کے حالات پر موقوف ہے۔ تاہم ایک بات تو بالکل واضح اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مناسب موقعہ پر نون کوآپریٹر ممبروں کو کونسلوں سے باہر آنا پڑیگا اور باہر کی جماعت کے ساتھ مل کر سول ڈس او بیڈنیس سے مقابلہ کرنا پڑیگا۔ کونسلوں کا داخلہ ہم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس مقابلہ کی تیاری کے لیے بمقابلہ بائیکاٹ کے، اسے بھی گوشۂ جنگ بنا لینا مفید ہے۔ اگر آج ہمیں ظنِّ غالب

پیدا ہو جائے کہ ہم وقفہ کی جگہ مقابلہ کی حالت میں ہیں، تو کم از کم میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ رائے نہ دونگا کہ کونسلوں میں جانے کا خیال بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ گو میں گیا پروگرام کی طرف سے بالکل مایوس تھا، تاہم جب تک ذرا بھی امید اس کی کامیابی کی کی جا سکتی تھی، میری کوشش یہی رہی کہ سب مل کر اسے کامیاب بنانے کی سعی کریں، اور کونسلوں میں جانے کا کوئی خیال سامنے نہ لائیں۔ بہرحال اگر ہم چاہیں، تو انتخاب کے بعد کا پروگرام آج ہی بنائے سکتے ہیں۔ چاہیں، تو اسے آیندہ سالانہ اجلاس پر موقوف کریں۔ یہ آخری صورت شاید زیادہ بہتر ہوگی۔ باہر کا کام کیا ہو؟ یہ سب سے زیادہ اہم چیز ہے اور اسی پر اس نئے گوشۂ جنگ کا مفید ہونا موقوف ہے۔ اس بارے میں حسب ذیل امور پر آپ کو توجہ دلاؤنگا۔

۱۔ تعمیری پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کا کام از سر نو شروع کرنا چاہیے۔ تفصیلات کی طرف میں ابھی آپ کو توجہ دلاؤنگا۔

۲۔ ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم جن سے غافل رہ کر ہم آیندہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔

۳۔ عوام کی سیاسی تعلیم تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ہم کو اپنی جدّ و جہد کی گذشتہ سرگرمی میں تیاری، اتحاد اور مقابلہ سب کام بیک وقت کرنا پڑے۔ لیکن موجودہ وقفہ میں ہمیں اس سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ قومی اتحاد نون کوآپریشن، عدم تشدّد اور سول ڈس اوبیڈینس کے اصول و مقاصد عوام کے دلوں پر نقش کر دیں۔ وہ اسے محض کسی مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں، بلکہ خالص جذبۂ حب الوطنی سے اپنا فرض سمجھیں۔

بکثرت ہندستانی زبانوں میں لٹریچر تیار کر کے تقسیم کرنا چاہیے۔ کانگریس کمیٹیوں کے ورکر اور والنیٹر قصبوں اور دیہاتوں میں دورہ کریں۔ ہر جگہ جم کر اس طرح تعلیم دیں، گویا عارضی سیاسی تعلیمگاہیں ہر طرف پھیل گئیں ہیں۔ اس کام کا ایک پروگرام تین مہینے کا یا چھ مہینے کا بنا لیا جائے۔ ہم اتنے عرصے کے اندر تمام ملک کو ایک خاص مقصد کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اگر حکومت کی جانب سے اس میں رکاوٹیں ڈالی

گئیں، تو وہ ہمارے لیے اور زیادہ مفید ہوگا۔عجب نہیں کہ اسی کے ذریعہ سے ہماری مطلوبہ فضا پیدا ہو جائے۔

۴۔ تعمیری پروگرام کا بقیہ حصہ!

البتہ میں یہ بات بالکل صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے کونسلوں میں داخلہ کی صرف ایک ہی صورت صحیح ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ کانگریس نہ صرف اس کی اجازت دے، بلکہ خود اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ اگر آج آپ کا فیصلہ اس کے برخلاف ہو، تو جیسا کہ میں بہ تفصیل عرض کر چکا ہوں، پھر ہم میں سے کسی فرد یا جماعت کو بھی نہیں چاہیے کہ اس کے خلاف قدم اٹھائے۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا معاملہ ہے، جس کے لیے ہم قومی نظام کی اطاعت سے باہر ہونے پر مجبور ہوسکتے ہیں۔ اگر آج بھی آپ کا فیصلہ یہ ہو کہ کونسلوں کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہیے، تو اس صورت میں میری رائے یہ ہوگی کہ بائیکاٹ کو داخلہ پر ترجیح ہے۔ کیونکہ ہمارے کام کے لیے اصلی چیز متحدہ جدّوجہد ہے۔ جو راہ ہم سب مل کر اختیار کر سکتے ہیں، وہ متفرق قدم سے بہتر ہوگی۔ اور جب تک اصول اور اعتقاد کا سوال نہ آئے، ہمیں اپنے نظام کی اطاعت سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

حضرات!

گیا کے موقعہ پر علمائے اسلام کی کانفرنس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ مسلمانوں کو کونسلوں کے لیے کھڑے ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔ دراصل مذہبی نقطۂ خیال سے اُن کے سامنے ترکِ موالات کی اصل تھی۔ اور جہاں تک طریقِ عمل کا سوال ہے، قدرتی طور پر انھیں ان تمام طریقوں سے انکار ہونا چاہیے، جن سے اصل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ بات کہ کونسلوں میں جانا اس کے لیے مفید ہے یا مضر، ایک ایسا معاملہ ہے، جس پر وہی لوگ رائے قائم کر سکتے ہیں، جنھیں ان معاملات کا تجربہ ہے، لیکن اس وقت خود ان لوگوں میں اختلاف تھا۔ پس ضرور تھا کہ حضرات علماء اسی پہلو کو اختیار کریں جس میں احتیاط ہو۔ بصورتِ اختلاف احتیاط اسی میں تھی کہ احتراز کیا جائے۔ لیکن میں آپ کو اطمینان

دلاتا ہوں کہ اگر آج آپ اس بارے میں ایک مطمئن فیصلہ کرلینگے، تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُن کی جانب سے اس معاملے میں اصرار ہو۔

ہندو مسلم اتحاد:

حضرات!

میں نے آپ کا اس قدر وقت در و دیوار کی فکر میں لے لیا۔ حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے، جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی بلکہ ہندستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہوسکتی ہیں، محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤنگا، مگر اس سے دستبردار نہ ہونگا۔ کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔

ملک کی موجودہ حالت کیا ہے؟ کون ہے جو ہندستان کے عشق و محبت کا ایک ذرہ بھی دل میں رکھتا ہو اور اسے صبر اور برداشت کے ساتھ دیکھ سکے۔ چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا اور دنیا سے کہا کہ وہ ہماری آزادی کا انتظار کرے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لیے گوش بر آواز ہے، ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور اپنے مجنونانہ کشت و خون کی کہانی اس کے لیے ترتیب دیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک، اس کی مدافعت اور سنگٹھن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔ ایک طرف سے کہا

جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ۔ دوسری طرف کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملہ سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی پکار بلند ہو رہی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بدنصیب ہندستان کی حفاظت کا دلولہ کب قائم رہ سکتا ہے۔ ایک طرف جلسوں اور اخباروں میں لوگوں کے اندر مجنونانہ مذہبی تعصبات ابھارے جا رہے ہیں، دوسری طرف نادان اور فریب خوردہ عوام ہندستان کی سڑکوں پر بیدریغ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اجمیر، میرٹھ، سہارن پور، آگرہ، پلول اور کہاں کہاں سخت فسادات ہو چکے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے نتائج کس قدر افسوسناک ہونگے۔

حضرات!

میں آج ان تمام لوگوں سے، جو ان جذبات کی تبلیغ کر رہے ہیں، صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت ناقابلِ برداشت ہے۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم آزادی کی طرف جا رہے ہیں، آپ ہمارا راستہ نہ روکیے؛ اگر آپ روکینگے، تو ہمارا فرض ہے کہ رکاوٹوں سے راستہ صاف کریں۔ میں آپ تمام حضرات سے جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہیں اور اپنے اندر ہندستان کا دماغ اور ہندستان کی زبان دونوں رکھتے ہیں، یہ عرض کرونگا کہ اگر آج آپ اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ نون کوآپریٹرز کونسلوں میں جائیں یا نہیں، تو مضائقہ نہیں۔ لیکن خدارا آج اس کا فیصلہ کر کے یہاں سے اٹھیے کہ ہندستان اپنی آزادی و نجات کی زخمی امیدوں کو بچائے رکھے، یا آگرہ اور سہارن پور کی خون آلود سرزمین میں دفن کر دے؛ آج آپ کو صاف صاف اس بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہیے اور اپنی تمام قوتیں اس کے لیے صرف کر دینی چاہییں۔ اگر آپ ایک دن کے لیے بھی اسے برداشت کرینگے، تو یقین کیجیے کہ برسوں کے لیے آپ کا سفر پیچھے پڑ جائیگا۔

فرقہ وار تنظیم:

حضرات!

ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کانگریس کی سیاسی حرکت

میں شریک نہ تھے مسلمانوں میں یہ جذبہ عام تھا کہ ہندستان میں اُن کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں، اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہونگے، تو ان کی ہستی پامال ہوجائیگی۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصہ تک ان کی قومی پالیسی یہ رہی کہ الگ رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کی جائے۔

لیکن غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گزشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اس سے واقف ہونگے کہ ۱۹۱۲ء میں میری سب سے پہلی صدا تھی، جو اس طرزِ عمل کے برخلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بُلایا کہ وہ علیحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں، کانگریس میں شریک ہوں، ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں، اور فرقہ وار تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گذری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی۔ لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آگیا، جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا۔ میں جب ۱۹۱۶ء میں رانچی میں نظر بند تھا، تو سُن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔

حضرات!

جس طرح میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا تھا، ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ میں حیرت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جو دماغی حالت اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حلقوں کی تھی، ٹھیک وہی آج ان حضرات کی ہو رہی ہے۔ وہی دلائل آج بھی ہمیں سُنائے جا رہے ہیں۔ وہی اسباب و بواعث آج بھی ان کی زبانوں پر ہیں۔ مسلمانوں کا یہ خیال اس کے ساتھ تھا کہ ان کی تعداد کم ہے۔ اور آج یہ تحریک ان لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے، جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامّل کے صاف صاف

کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے، نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔

میں اس وقت اس معاملے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا ہوں جو دلائل ان تحریکات کی تائید میں بیان کیے جاتے ہیں، مجھے ان کی صحت سے بالکل انکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ فلاں سنہ میں فسادات ہوئے اور ان میں ایک فریق کا نقصان زیادہ ہوا، اس لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنا علیحدہ سنگھٹن کرلے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریق استدلال صحیح تسلیم کرلیا جائے، تو ہندستان کی ہر جماعت اپنے نقصانات کی ایسی ہی ایک فہرست تیار کرسکتی ہے۔ اور اس کے بعد سنگھٹن کا اعلان دے سکتی۔ اگر بمبئی کے گزشتہ بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالی جائے، تو کئی فسادات ایسے ملینگے جو خود مسلمانوں کے دو فرقوں میں ہوئے ہیں۔ اور ایک فرقے نے دوسرے کو اچھی طرح لوٹا اور قتل کیا ہے۔ البتہ میں اس بات کا صاف صاف اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے نئے دور کے بعد، ملتان میں فساد کا ہونا اور وہاں کے مسلمان بلوائیوں کے ہاتھ سے ہندوؤں کو سخت نقصان کا پہنچنا، ایک ایسا افسوسناک حادثہ ہے جس پر ہر مسلمان کے دل پر زخم لگنا چاہیے۔ تاہم ہندستان جیسے ملک میں جہاں کروڑوں انسان بستے ہیں، جو ابھی ابھی نئی زندگی کے دور میں داخل ہوئے ہیں، اور جہاں غلط مذہبی تعصب اور بیجا مذہبی جوش کا ابھرآنا کچھ دشوار نہیں ہے، ایسے حوادث ناممکن نہیں کردیے جاسکتے۔ اسکا صحیح علاج صرف یہی ہے کہ ملک کے دیگر طبقات اس کی وجہ سے فریقانہ جذبہ پیدا نہ کریں۔ جس کی زیادتی ہو، اسے ملامت کی جائے، جس پر ظلم ہوا ہو اس سے ہمدردی کی جائے۔ یہ علاج نہیں ہے کہ ایک مقامی معاملہ کو طول دے کر اور تمام ملک اور فرقہ کا مسئلہ بناکر کسی ایک فریق کو مقابلہ کی دعوت دی جائے۔ پھر دوسرا فریق بھی نئی نئی تیاریاں کرے اور اس طرح ختم نہ ہونے والی جنگ قائم ہوجائے۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ہندستان کی ہر جماعت کو اپنی اندرونی اصلاح و درستگی کے بیشمار کام در پیش ہیں اور ضروری ہے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے

کے لیے کوشش کرے۔ لیکن میں اس سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ کوئی ایسی تحریک اس حالت میں قائم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا خمیر فرقہ وار فسادات اور باہمی جنگ کے خون سے مہیا کیا گیا ہو۔

ان تحریکات کے بعض ذمہ دار حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہیں ہے اس لیے کہ وہ ہمیشہ مقابلہ کا وعظ کہہ کر آخر میں اتحاد و محبت کا بھی پیغام سُنا دیتے ہیں۔ ان حضرات سے کہونگا کہ آپ نے ہمیں غلط راستہ کی طرف بلایا ہے۔ لیکن اب فطرت انسانی کے انکار کی دعوت نہ دیجیے۔ حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو۔ مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی بخش نہ سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کر کے دوسری طرف محبت واتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں۔

اسی طرح میں شدھی کی تحریک کی نسبت یہی عرض کرونگا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وارانہ کشمکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے ہیں، لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں متحدہ قومیت کی ضرورت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہندستان میں ایک طرف سے ملیچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہینگی، تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے، جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

حضرات!

میں ملک کی تمام جماعتوں سے عرض کرونگا کہ انھیں ایک مرتبہ ہندستان کی قسمت کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندستان آزادی و نجات حاصل کرے، تو پھر انھیں اور تمام کام اس کے لیے ملتوی کرنے ہی پڑینگے۔ خواہ وہ کام انھیں کتنے ہی محبوب ہوں لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔

میں آج اس پلیٹ فارم سے جو ہندستان کی متحدہ قومیت کا گہوارہ ہے، تمام ہندو و مسلمانوں سے وطن کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اُس کی امیدوں کو اس بے دردی کے ساتھ پامال نہ کریں، اور بلا اس بحث کے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے۔ آیندہ کے لیے ان تمام سرگرمیوں کو بند کر دیں جو شدھی مومنٹ، اس کی مدافعت اور فرقہ وار تحریکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اگر بند کر دینے کے لفظ سے وہ متفق نہیں ہو سکتے، تو کم از کم ملتوی کر دیں۔ اگر وہ ایسا کرینگے، تو نہ صرف اپنے وطن کی بلکہ تمام عالم انسانیت کی ایک سب سے بڑی خدمت انجام دینگے۔

ہندستان کا میثاقِ ملّی:

حضرات!

اس سلسلے میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجیے کہ اب ہمیں اس باب میں تساہل نہیں کرنا چاہیے کہ ہندستان کے لیے ایسا میثاقِ قومی تیار ہو جائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علائق اور روزمرّہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کر دے۔ اس اعتبار سے ہندستان ایک عجیب ملک ہے بہت ممکن ہے کہ تیس کروڑ انسانوں کی آزادی صرف اس لیے تاخیر میں پڑ جائے کہ کسی مسجد کے سامنے سے ایک جلوس ڈھول بجاتا ہوا گزر گیا، یا کسی راستہ کے درخت کی شاخ کاٹ ڈالی گئی پس جب ملک کی مصیبتوں کی نوعیت کا یہ حال ہے تو ہمیں ان مسائل کے قطعی اور دائمی فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر بھی غور فرمائینگے بہتر ہوگا کہ منتخب افراد کی ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کر دی جائے اور آیندہ اجلاس سے پہلے ایک مسودہ تیار کرلے۔

خاتمہ:

حضرات! قوموں کے تمام بڑے دنوں کی طرح آج کے دن کے نتائج بھی دو انتہائی قسموں میں منقسم ہیں۔ آج ہم بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بہت بڑی ناکامی بھی، ہمارے حصّے میں آسکتی ہے۔ ہمارے عزم، ہمارے ثبات اور ہماری محبّ الوطنی کے لیے آج بہت بڑی آزمایش درپیش ہے۔ آیئے! اس پر غالب آئیں اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

خطبۂ صدارت

انڈین نیشنل کانگریس

(رام گڑھ، مارچ ۱۹۴۰ء)

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب سترّہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدّ و جہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدّت، کوئی بڑی مدّت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب وقت کے پرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترّہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دُور کا تھا اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرے۔ ہم ہر منزل میں ٹھیرے، مگر رُکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دُنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں، تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دُور ایک دھندھلا سا نشان دکھائی دیگا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دُور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھایئے، اور سامنے

کی طرف دیکھیے، نہ صرف منزل کا نشان صاف دکھائی دے رہا ہے، بلکہ خود منزل بھی دُور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے، ہماری جدّوجہد کی آزمایشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دُور، اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے، وہیں طرح طرح کی نئی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں، اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمایش اُن کے متضاد اِمکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزلِ مقصود سے بالکل نزدیک کر دے اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا ہے، وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے، جو مُلک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزّت ہے، اس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزّت کے لیے شکرگزار ہوں، اور ذمہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہینگی

وقت کا اصلی سوال:

اب میں سمجھتا ہوں، مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہیے۔ ہمارے لیے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلانِ جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اُٹھایا ہے، وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟۔

غالباً کانگرس کی تاریخ میں اس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاسِ لکھنؤ میں یورپ کی بین القومی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک لمبی تجویز منظور کر کے اس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور اس کے بعد سے وہ

کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصّہ بن گئی ۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا ۔

ان تجویزوں کے ذریعہ ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا:

سب سے پہلی بات، جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے؛ ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورت حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے، ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں، بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانے کی بیشمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے، اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے میں ابھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں، ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے ۔ یہ ناگزیر ہے، کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوراً اثر ڈالیں ۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے ۔ یہی احساس تھا، جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی ۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نازسی ازم کی جوار تجاعی (ری ایکشنری) (reactionary) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں، ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصوّر کرتا ہے ۔ اور اس کا دل اور دماغ ان قوموں کے ساتھ ہے، جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں ان تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں ۔

لیکن جب فیشی ازم اور نازسی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا، تو ہمارے لیے ناممکن تھا کہ ہم اُس پرانے خطرے کو بھلا دیں، جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے، اور جس نے فی الحقیقت ان نئی

اِرتجاعی (reactionary) تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچا یا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوّت کی طرف ہے۔ اسے ہم اِن نئی اِرتجاعی (reactionary) قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے، یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے، ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول دی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کرلی، تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے اور آزاد پسند سے محروم کردیا گیا ہے، اس میں کوئی حصہ نہیں لیگا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصہ لے سکتا ہے، جب کہ اُسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازسی ازم اور فیسشی ازم سے بیزار ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں، کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی (TRADITIONAL) خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لیے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی، جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔
یہ تجویزیں کانگرس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔
کانگرس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔ اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہوگئی۔
اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکونگا، اور درخواست کرونگا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیے۔ پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے؟
برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا، اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگرس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔
تاہم اس نے کچھ عرصے کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا اور اس پر آمادہ ہوگئی کہ ایک خاص

شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرلے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں، اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدّت تک قائم رکھا جا سکتا ہے، قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورتِ حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے، ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں، اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (mentality) میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی (diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی کہ اس موقعہ پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے، اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا؟ تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصّہ رہا ہے، اُس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا، اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو، لڑائی میں اس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمایندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقعہ دے دیا جائے، جنھیں خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ

غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا، اور اس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ویلرا۔ نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک السٹر (ulster) کا سوال قابلِ اطمینان طریقے پر طے نہیں ہوتا، وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے!

لیکن برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانیہ حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد (مگر کسی نامعلوم زمانے میں) برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کا درجہ (status) ملنے والا ہے، اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح، کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک ڈھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے!

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اس کے اصلی رنگ رُوپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں، ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دُور نہیں، جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگینگے!۔

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سلگی تھی۔ اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر پادشاہ بحیر، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دنیا کے سامنے آئے۔ اور ان کا جو کچھ حشر ہوا، دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِّ فعل (reaction) شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں نازیزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت (DICTATORSHIP) دنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔

جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی، تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے ابھر آئیں: ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی، دوسری ارتجاعی (reactionary) قوتوں کو آگے بڑھانے والی۔ اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لیے فیشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی ناقابلِ برداشت تھی، اور جو اسے برطانوی سامراج کے لیے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی، تین برسوں تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نازی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سینیا، اسپین، آسٹریا، چیکوسلاواکیا اور البانیا کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے اپنی، ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے، انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ انتہائی شکل میں اُبھر آیا، اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا، تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہو گئی۔ اُسے لڑائی کے میدان میں اترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اُترتی، تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ اب چھوٹی قوموں کی آزادی کے پُرانے نعرے کی جگہ جمہوریت، آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی، اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ ۳ ستمبر کا اعلانِ جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بےچین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (reactionary) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں، ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیے!

کانگرس کا مطالبہ:

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۷ ستمبر کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی، تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار

ہوتے رہے ہیں۔ اعلان جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کی جا سکتی تھی، اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی، جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے؛ اپنے کانوں کو بند کر لیا۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اٹھایا، جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے، کہ اس صورتِ حال میں اس کے لیے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا، بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندستان کو دعوت دی گئی ہے، تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (tragedy) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے، اور یہ واقعی اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ آزادی، جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم (order) سے دنیا کو آشنا کیا جائے، تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے، خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑیگا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبے کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا۔ اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کریگا، تو مجھے یقین ہے، میں آنے والے مؤرخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت (reason) کا ایک سادہ مگر ناقابلِ رد نوشتہ (document) ہے، جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی، لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی؛ یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ

تھی پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے دنیا کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، مبتلا کی گئی۔ اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی، تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خوداختیاری فیصلہ (self-determi nation) ہتھیاروں کی حدبندی، بین القومی (international) پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ اُن کے دلوں میں امیدیں سلگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی! ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا! آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت (reason) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑیگا؟

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگرس کا پہلا قدم:

کانگرس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جو ہندستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کے لیے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے، جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومت ہند کے سرکاری علمِ ادب (official literature) کے اُلجھے ہوئے انداز، اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمّل نمونہ ہے، صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی، اس قدر بتانے پر مشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے، جو صرف یورپ کے امن اور بین القومی (international) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ جہاں تک ہندستان

کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالیسی اس کے سامنے ہے اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان ہوا، اور ۲۲ اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کرسکتا۔ اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیے۔ جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا، وہ اس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے:

> ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالیسی کو منظور کرے۔ کمیٹی کانگرس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں۔

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ تو اس سلسلے کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ کہاں تک پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے، جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے ۶ فروری کو شائع کیا، اس کی آخری کڑی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندستان جلد سے جلد وقت میں جو صورتِ حال کے لحاظ سے ممکن ہو، برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کرلے، اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم ہو جائے۔ مگر وہ ہندستان کا یہ حق ماننے کو تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے، اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندستان کے لیے خود اختیاری فیصلے

(self-determinatien) کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت (touch) سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ مگر جونہی ہندستان نے یہ سوال اُٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہہ اس لڑائی کا مقصد ہے، مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ اُمید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے، اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں:

> ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت کر لیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آیندہ اپنی آزادی کو بیجا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائینگی۔

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے، مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے، بلکہ ٹھیک ٹھیک برِاعظم یورپ کی اس عام ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے، جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے، ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا، اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے

نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں، اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلانِ جنگ کے بعد یہ سوال اُٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے، اور ہندستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۹ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ۱۹۳۹ء کی اس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے، ہندستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے! اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہشمند ہے کہ ہندستان جہاں تک جلد ممکن ہو، نوآبادیات (dominion status) کا درجہ حاصل کرلے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ وہ اس کی "بہت زیادہ خواہشمند ہے"۔ مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندستان کے حق کا ہے۔ ہندستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اینٹ ہے۔ وہ اسے ملنے نہیں دیگا۔ اگر یہ ہل جائے، تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائیگی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے، ہمارے لیے صورتِ حال بالکل واضح ہوگئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں،

جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چھوٹے کی فتحمندیوں کے لیے لڑائی میں حصّہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے متقابل سمت جارہی ہے۔

ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں، جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلانِ جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں، اس کا رُخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف اُبھر آیا ہوگا کہ اب اُسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں، میں آپ کے لبوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (cooperation) کا جو قدم ۱۹۳۱ء میں اٹھایا تھا، ہم نے اعلانِ جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترکِ تعاون (Non-cooperation) کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں، جب قدم اُٹھا دیا جائے، تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رُکیگا تو پیچھے ہٹیگا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں۔ جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھینگے!۔

باہمی مفاہمت:

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی اس کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے، جب کہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کردے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اُصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں، مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خودغرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔

آج بھی ہم علی الاعلان بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (reactionary) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ وبالا کر دیے اور انصاف اور معقولیت (reason) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ اُبھار رہی ہے، وہیں اُمید کا ایک دوسرا رُخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے، جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف ابھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم (order) کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے، اور معقولیت، انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بیقرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا، اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر اُبھر رہی ہے؛ اور اس طرح ابھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلہ کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیّت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا، آیندہ کے لیے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح اُمیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جاتیں؛ معقولیت اور انصاف کے دَور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بےمثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اُٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی ہے کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے!

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو

ہے، جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے ہیں جو ان پر کھولا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں، بلا تامّل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا، اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے، جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے، برطانوی سامراج آج بھی اسی طرح امن اور انصاف کی راہ پر کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعووں کے لیے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے، اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے!

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں:

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلّق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گزشتہ ستمبر میں جب اعلانِ جنگ کے بعد کانگرس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اٹھایا جا سکیگا۔ بلا شبہہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں، جو سیاسی جدّ و جہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکیں، جہاں تک کانگرس کے قدم پہنچ گئے ہیں، اور براہِ راست اقدامِ عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے، متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی

آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے ہندستان کی ذہنی بیداری اب ان ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفّظ کے لیے مجبور رہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہشمند نہ ہوں، وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضے سے بے بس ہو رہی ہیں اور انھیں بھی ہندستان کی سیاسی منزلِ مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمائشی سوال نے صورتِ حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے ہٹا دیے، وہیں اس گوشے کو بھی بےنقاب کر دیا۔ ہندستان اور انگلینڈ دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ دارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے۔ بار بار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو ابھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے، اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے، تو یہ ہندستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا، اور ہمارے لیے اب بےسود ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے، لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا، یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبّروں سے اُمید رکھتے تھے کہ کم از کم اس گوشے میں وہ اپنے طرزِ عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کرینگے۔ لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے،

اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی اُمیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا، اور جس دَور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ ختم ہو گیا، اسے بھی ختم ہونا باقی ہے۔
بہر حال اسباب کچھ بھی رہے ہوں، لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے، اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے، کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کریگی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اُٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پروا ہ کر اٹھیگا، یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔
لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی یہی ہونے چاہییں کہ اُس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہوتے چاہییں کہ اُسے ہندستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اس غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دَور ختم کرنے پر مائل ہے، تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہینگے، وہ یہی گوشہ ہے۔
کانگرس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے، وہ کیا ہے؟ کانگرس کا اوّل دن سے یہ دعوا رہا ہے کہ وہ ہندستان کو بہ حیثیتِ مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے، اور جو قدم بھی اُٹھانا چاہتی ہے، ہندستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگرس نے یہ دعویٰ کر کے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے، اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے، اور کانگرس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگرس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔
جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں: فرقہ وارانہ مسئلے کی موجودگی، اس کی اہمیت، اس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلہ کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا، جس سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتلایا جاسکتا، اور اگر بتلایا جاسکتا ہے، تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں اس واقعے کو بطور ایک ناقابل انکار حقیقت کے پیش کرونگا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے، اور جب بھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف اور قطعی شکل میں مان کر اٹھایا:

۱۔ ہندستان کا جو دستور اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آیندہ بنایا جائے، اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں، نہ کہ اکثریتیں۔ اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے، نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرز عمل اس بارے میں اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اگر کیا جاسکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرز عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے، جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے اداء فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا

نہیں ہوا، جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگرس کے دماغ پر نہیں گزرا، جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا، اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرزِ عمل تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرزِ عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں، مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں، تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمایندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمایندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رایوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے، فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرتِ رائے نہیں ہوگی، خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے، تو کسی غیر جانب دار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے، جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیشبندی ہے۔ ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئینگی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابلِ عمل تجویز ہو سکتی ہے، تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرزِ عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں، اور پوری کوشش کر چکی ہے، اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے، تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی رہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندستان کے مسئلے کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے، تو کیوں برطانوی حکومت ہندستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا

موقع نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کرلیں؟

ہم میں تفرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے تفرقے مٹانے چاہییں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندستان کے مسلمان اور ہندستان کا مستقبل:

یہ ہندستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے، جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے، جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں، جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں، تو میں اُن سے درخواست کرونگا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کریں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے، جس درجہ یہ بات، ہندستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بیشمار غلط فہمیوں کی پیدایش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر اُن کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا،

جس کے بعد وہ ہندستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا، تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ کی پیداوار ہے، جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے اُبھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں؛ ایک ہندو قوم ہے، اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہے؛ اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلیگا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائیگی، اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائیگی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤنگا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دونگا کہ اگر اس معاملے کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹنٹ گورنر مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے اور گو پچاس برس گذر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے، تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے، جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور

گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصوّر کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد کے ساتھ نوعیت (kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے، ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لینگے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔ اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اُسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے، کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکیگی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے

مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیّت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے، تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائینگے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصوّر کرتے رہیں، تو بھی اس تصوّر میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیّت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کر سکے۔

ہندستان کا آیندہ دستورِ اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو، مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاقی (Federation) کا جمہوری دستور ہوگا جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہونگے، اور فیڈرل مرکز کے حصّے میں صرف وہی معاملات رہینگے جن کا تعلّق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلّقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لا سکتا ہے، اُن اندیشوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے، جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اُس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے: ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں، اور گو تیرنا چاہتے ہیں، مگر دریا میں اُترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف و خطر کُود جانا چاہیے جوں ہی ہم نے ایسا کیا، ہم معلوم کر لینگے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے!

مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بنیادی سوال

تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی بار غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی، جو ۱۸۸۸ء میں کانگرس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کرلی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب و ہوا میرے غور و فکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اُس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے، اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں، اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اس کی بنیادوں تک اتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندستانی مسلمان ہندستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے، تو بلاشبہہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آیندہ کا کوئی وعدہ، دستورِ اساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اور ہمیں بھی خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے، تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں

بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔
وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اُتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے
قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندستان کے قومی مقصد کی
راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک
ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کر سکوں۔
میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے
سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت
کرے!

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو
یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء
تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۱۹ء کے اواخر میں جب
چار برس کی نظربندی کے بعد میں رہا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت
اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گذر چکے
اس عرصے میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات
کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے مسلمانوں
کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اس پر پھر مشتبہ
ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤنگا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی
کوشش کرونگا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤنگا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ
سے انھیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات
کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، اُن میں سے کوئی حالت ایسی نہیں، جو میرے
سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں

کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے صرف گزرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں، میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنی ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں، اور آج بھی اُن سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا، مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کرونگا۔ مگر میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کرونگا یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے، ہم اسے وقتی جذبات کی رَو میں بہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کر لیں، وہ اس کے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائینگے۔

مسلمان اور متّحدہ قومیّت

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں

نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، بلکہ اِس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (factor) ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی۔ اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے، پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جس کی اُسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے، جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے؛ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندستانی ہوں اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بےشمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے، جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسطِ ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات

اگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (revival) کی مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں یہ ترقی سے انکار کرنا ہے۔
ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قدرت کی مُہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں، یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم، اور ناقابلِ تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے، اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

خاتمہ:

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لونگا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں، مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجیے۔ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے: اتحاد۔ ڈسپلن (discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا، اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔
ہماری آزمایش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دے دی ہے۔ کوشش کیجیے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

مسلمانانِ دلّی کا اجتماع

جامع مسجد، دلّی، اکتوبر ۱۹۴۷ء

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے، جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہجہان کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں پکارا۔ تم نے میری زبان کاٹ لی؛ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیے۔ میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں، نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے

دن اپنے لیے چُن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی، تم نے کونسی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں ہے؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا ہے۔ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی ان سُنی برابر کر دی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں تم دیکھ رہے کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسا تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمھارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی، اور راہنمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے۔ حال آنکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے، اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دورِ ماضی کی طرف پلٹ جاؤ، تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

> جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی

ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور
تعطّل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل
کا مؤرخ لکھیگا کہ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں
کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویّہ اختیار
کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا
ہے۔ آج ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔
یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار
قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس
نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی، اور یہی وہ انقلاب ہے
جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ
تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بُری شے آگئی ہے۔ ہاں، تمھاری
بیقراری اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بُری
شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے
مدّتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم
کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے، اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر
تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ اِدھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی، اور اُدھر گمرہی کا
خطرہ بھی پیش آگیا!

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔
میں نے اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں
کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا
چاہتا ہوں متحدہ ہندستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو
جس ڈھب سے ہوا دی گئی، اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں

سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔
پچھلے سات برس کی رُوداد دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ قیادت کی فاش غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔
اب ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔
ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کرسکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ "تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو۔ اور بدعملی کو ترک کر دو۔" یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دودھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔
یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو، اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟
یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اُچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔
عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمھارا

جوش وخروش بیجا تھا اسی طرح آج یہ تمھارا خوف وہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچّے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے، اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو، تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا: "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔" ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتے آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ، جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں لیکن مجھے تمھاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے، تو پھر اس طرح بدلو جس طرح "تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔" آج بھی کہ ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیّر کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو

اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔
میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو، اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اِس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ تھا، انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں، اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر اَدھورے ہی رہینگے۔
آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اُجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھالیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے، جو سمندر میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے، تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اُٹھی، تو اس کا رُخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں، تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے، آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے، کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔
عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے، وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا، یہ اعلان کہ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ۔ [۵]

---

۵ نہ سست ہو، نہ ملول، اور یاد رکھو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم ماننے والے ہو۔

آج کی صحبت ختم ہوگئی مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مولانا غلام رسول مہر کے نام

۱۲ اپریل ۱۹۲۷ء

عزیزی، السلام علیکم

پچھلے خط کا جواب آپنے اب تک نہیں بھیجا۔ غالباً اخبار کے اہتمام میں مشغول ہیں۔ میں نے مولوی عبدالرزاق صاحب سے کہہ دیا تھا کہ آپ کے نئے اخبار کے جتنے پرچے آئیں، فائل بنا کر رکھ دیں، تاکہ میں بوقت فرصت دیکھ سکوں۔ آج شب کو دیکھنے کی مہلت ملی۔ اِس وقت نمازِ صبح کے بعد قلم اُٹھایا، تو سب سے پہلے آپ یاد آئے۔ چند اُمور جو ذہن میں آئے، لکھتا ہوں:

۱۔ "انقلاب" کے پانچ نمبر تھے، جو میری نظر سے گزرے۔ آپنے "زمیندار" سے الگ ہو کر نیا اخبار جاری کیا، لیکن اس سے زیادہ کوشش نہ کی کہ "زمیندار" کی ہوبہو ایک دوسری شکل ہو۔ جہاں تک مسلک کا تعلق ہے، ضرورت نہ تھی کہ کسی تغیر کا اعلان کیا جاتا، لیکن کوشش کرنی تھی کہ اس سطح سے نسبتاً بلند سطح لوگوں کے سامنے آئے، جو "زمیندار" کی قائم ہو چکی ہے۔ جہاں تک روزانہ اخبار کا تعلق ہے، اُردو میں اِس وقت تک کوئی بلند کام انجام نہیں پایا اور سعی و تلاش کا پورا میدان باقی ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی محنت گوارا کریں، تو کم از کم "زمیندار" کی سطح سے ایک بلند سطح قائم ہو جائے اور جو لوگ "زمیندار" خریدتے ہیں، وہ بھی "انقلاب" کی ضرورت محسوس

کریں، مثلاً اس پر قناعت نہ کیجیے کہ تار کی خبروں کا ترجمہ کر دینے اور ایڈیٹوریل
صفحے کے لکھ دینے کے بعد ایڈیٹوریل اسٹاف کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ
بھی کچھ مواد اخبار میں ہونا چاہیے، اور اس کا بآسانی انتظام ہو سکتا ہے۔ عام انگریزی
اخبارات میں فوائد اور دلچسپی کی اتنی باتیں ہوتی ہیں کہ اگر کسی ایک اخبار ہی
سے کالم، نصف کالم کا مواد اخذ کر لیا جائے تو اردو روزانہ کے دو تین کالموں
کے لیے بہترین ذخیرہ مہیا ہو جا سکتا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ تو یہ ہوگا کہ دس پندرہ
روپیہ ماہوار کا خرچ گوارا کر کے انگلستان کے چند رسائل اور اخبارات منگوا
لیے جائیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے، تو، خود ہندوستان کے انگریزی اخبارات
کافی ہیں۔ "اسٹیٹسمین" "انگلش مین"، "ٹائمز آف انڈیا"، مدراس "ٹائمز" اور "پایونیر" میں
بشمار چیزیں کام کی ہوتی ہیں اور اردو اخبار کا ایک قلم بھی انھیں مس نہیں کرتا۔
خصوصاً "اسٹیٹسمین" اور "انگلش مین" کے ہفتہ وار پرچوں میں تو اس قدر مفید معلومات
ہوتی ہیں کہ صرف انھیں کا اقتباس ہفتہ بھر تک کام دے سکتا ہے۔ اردو میں
صرف ترجمہ اور اقتباس سے اس قدر مفید اور دلچسپ اخبار بن سکتا ہے کہ اس کا
ہر نمبر پڑھنے والوں کے لیے فواید و معلومات کا ایک درس ہو۔

عام مسلمانوں کو بلا شبہ سیاسی و معاشرتی معلومات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن
اگر ہماری اخبار نویسی مقاصد سے خالی نہیں ہے، تو ہمیں پیدا کرنی چاہیے۔
عوام کی دلچسپی کی چیزیں لکھی جائیں، لیکن اس کے ساتھ ہی مفید سیاسی معلومات
بھی ان تک پہنچا دی جائیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں زمانے کی رفتار تیز ہے ہندستان
کے لیے سست نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی وقت تیزی کے ساتھ نکل جائیگا اور مسلمان
اس منزل پر بہت جلد اپنے آپ کو پائینگے۔ جہاں خود ہندوستان کی اسلامی
زندگی کے لیے انھیں اپنی عدم استعداد پر متاسف ہونا پڑیگا۔ ضرورت ہے کہ
لوگوں میں مسائل و حوادث کے فہم و نظر کا صحیح سیاسی ذوق پیدا کیا جائے اور
ایسی چیزیں ان کی معلومات میں لائی جائیں، جن سے ان کی ذہنیت میں بلندی و

دستانت پیدا ہو۔ دنیا کی عام سیاسی و معاشرتی حالت، دنیا کی مختلف قومی تحریکات علمی و تمدنی تغیرات، مغرب و مشرق کی کشمکش کے نئے گوشے، مشرقی ممالک و اقوام کی نئی سرگرمیاں اور اسی طرح کی ضروری معلومات سے اگر مسلمانوں کے اخبارات خالی رہیں، تو یہ ان کی ذہنی پستی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا۔

اس سے بھی بڑھ کر روزانہ اخبارات کے لیے لکھنے کی جو چیزیں ہیں، وہ ملک کی سیاسی حالت و نوعیت ہے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں بہ حیثیت جماعت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ان کے (ہندوؤں کے) عوام ملک کی سیاسی حالت سے جس قدر واقفیت رکھتے ہیں۔ اس قدر ہمارے (مسلمانوں کے) خواص بھی نہیں رکھتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اگرچہ ہندوؤں کے مقابلے میں شور و غل بہت مچایا جاتا ہے، لیکن سیاسی مقابلہ و کشاکش کی صحیح استعداد پیدا کرنے کی فکر نہیں کرتا۔ ہندوستان جدید سیاسی اور کانسٹی ٹیوشنل زندگی اختیار کر چکا ہے۔ آیندہ جو کچھ بھی ہوگا، نیابتی اور انتخابی اصولوں پر ہوگا اور زندگی کے ہر میدان میں وہی جماعت کامیاب ہوگی، جو سیاسی زندگی کے لیے صحیح اور طاقتور رائے عامہ اپنے ساتھ رکھےگی۔ نوکریوں اور فرقہ وارانہ حقوق کا بھی تمام تر دار و مدار اسی پر ہے۔ پس ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کی سیاسی تعلیم و ترقی کے لیے بہ کثرت مضامین لکھے جائیں۔ انھیں بتلایا جائے کہ ہندستان کا نظامِ حکومت کیا ہے؟ مستقبل کے تغیرات کیا کیا متوقع ہیں دنیا کے موجودہ سیاسی اصولِ مملکت کس طرح ہندوستان پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ نیابتی اور انتخابی اصولوں سے کیا مقصود ہے؟ اور مسلمان کیونکر ہندستان میں ایک طاقتور نیابتی زندگی حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ مباحث اس قدر سہل اور پیش افتادہ ہیں کہ بغیر کسی محنت و کاوش کے لکھے جا سکتے ہیں۔ کم از کم دوسرے تیسرے دن بہ عنوانِ مختلف اس کا کوئی نہ کوئی پہلو واضح کرنا چاہیے۔ صرف شدھی اور سنگھٹن کو پیٹتے رہنے سے مسلمان طاقتور نہیں ہو جائینگے۔ البتہ یہ ضروری

ہے کہ یہ چیزیں اس طرح نہ لکھی جائیں کہ لوگ اُکتا جائیں۔ آپ کو اخبار چلانا اور
عوام ہی میں مقبول بنانا ہے۔ اڈیٹوریل کالموں میں وہ سب کچھ لکھتے رہیں،
جو لکھا کرتے ہیں۔ پہلے صفحے کی گنجائش اچھی خاصی ہے، جو نصف کے قریب لوح
میں ضائع چلی جاتی ہے۔ اس میں گنجایش نکالیے اور کم از کم دو تین کالم اس قسم
کے تراجم و مطالب کے لیے مخصوص کر دیجیے۔

۲۔ آپ نے یہ بہت ہی بہتر کیا کہ باوجود "زمیندار" سے علیحدگی کے تلخ حالات کے،
کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے چشمک و رقابت پائی جاتی ہو۔ امید ہے، آیندہ
بھی شدت کے ساتھ اسی مسلک پر قائم رہینگے۔ مولوی ظفر علی خان صاحب نے
بھی "زمیندار" میں مخالفت کی جگہ موافقت و مساعدت کی اسپرٹ ظاہر کی۔
مجھے اُمید ہے کہ وہ بھی اسی پر قائم رہینگے۔

۳۔ باوجود آپ کی کوشش و محنت کے مجھے اندیشہ ہے کہ آپنے علیحدگی اور
اجراءِ اخبار میں جلدی کی۔ خدا کرے، جلد از جلد آپ کامیاب ہوں۔ اب
چونکہ اخبار جاری ہو چکا ہے، اسے جاری ہی رہنا چاہیے اور راہ کی تمام
مشکلات دُور کرنی چاہییں۔ اگر آپنے اپنے حالات لکھے، تو جو کچھ سمجھ میں آئیگا
لکھونگا۔

گزشتہ خط کا جواب وصول نہیں ہوا۔

فقیر ابوالکلام

نواب صدر یار جنگ

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شیروانی

کے نام

(۱)

بمبئی میل (براہ ناگپور)

۳ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرّم

دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اس کا اثر باقی ہے۔ سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں، اس وبالِ دوش سے کیونکر سبکدوش ہوں۔ دیکھیے "وبالِ دوش" کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں!

۲۹ جولائی کو اس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گزرے کہ کل ۲ اگست کو بمبئی کے لیے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا، اب پھر اپنے ساتھ واپس لیے جا رہا ہوں:

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

مگر دیکھیے، صبح چار بجے کے وقتِ گرانمایہ کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے! قیام کی حالت ہو، یا سفر کی، ناخوشی کی کلفتیں ہوں یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں ہوں،

یا دل و دماغ کی افسردگیاں، کوئی حالت ہو، لیکن اس وقت کی مسیحائیاں افتادگانِ بسترِ الم سے کبھی تغافل نہیں کر سکتیں:

فیضے عجیبے یافتم از صبح ببینید
ایں جادۂ روشن رہِ میخانہ نہ باشد

میں ایک کوپے میں سفر کر رہا ہوں۔ اس میں چار کھڑکیاں ہیں، دو بند تھیں، دو کھلی تھیں۔ میں نے صبح اُٹھتے ہی دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جتنی گرم ہوتی جاتی ہے اتنی ہی ہوا کے جھونکوں کی خنکی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس بسترِ کرب پر ناخوشی[۵] کی کلفتوں نے گرا دیا تھا۔ اسی پر نسیمِ صبحگاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اُٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہوگی، جب خواجہ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:

خوشش باد انسیمِ صبحگاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد!

ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جاری ہے جس منزل سے اس وقت تک گزر جاتا تھا، ابھی تک اس کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دیتا۔ سوچتا ہوں، تو اس معاملۂ خاص میں وقت کے معاملۂ عام کی پوری تصویر نمایاں ہو رہی ہے:

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

رات ایک ایسی حالت میں کٹی، جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں، نہ سکون سے — آنکھ لگ جاتی تھی، تو سکون تھا؛ کھل جاتی تھی، تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہوگئی: ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا، تو دوسرا تخریب کی برہم زنی:

---

۵ یہاں "ناخوشی" سے محض خوشی کی نفی مقصود نہیں ہے، بلکہ فارسی کا "ناخوشی" مقصود ہے۔ فارسی میں بیماری کو ناخوشی کہتے ہیں۔

بیداریِ میانِ دو خوابست زندگی　　گردِ تخیل دو سرابست زندگی

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است　　یعنی طلسمِ نقش بر آبست زندگی

تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی ۔ صبح کی چائے کے لیے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو عبداللہ اسپرٹ کا چولھا اور ریانی کی کیتلی، پانی بمقدارِ مطلوب سے بھری ہوئی، ٹیبل پر رکھ دیتا ہے ۔ چائے دانی اس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکمِ وضع الشئی فی محلّہ یہی اس کا محلِ صحیح ہونا چاہیے ۔ مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ وضع الشئی فی غیر محلّہ میں داخل ہو جاتا ۔ اگر صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے، تو اکثر حالتوں میں عبداللہ آکر چائے دم دے دیتا ہے ۔ نہیں آیا، تو خود مجھے ہی اپنے دستِ شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں ۔ "اکثر حالتوں" کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ تمام کلیوں کی طرح یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے ۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رک بھی جاتی ہے، مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی ۔ پھر جب نظر آتی ہے، تو اس کی معذرتیں میری فکرِ کاوش آشنا کے لیے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبحگاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے ۔ اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے، عبداللہ کو اور زیادہ سُلا دیتی ہے ۔ الارم کی ٹائم پیس بھی اس کے سرہانے لگی رہتی ہے، پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا ۔ معلوم نہیں آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے، مگر مجھے شیخ شیرازی کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے اور اس پر مطمئن ہو چکا ہوں :

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بہر حال چائے کا سامان حسبِ معمول مرتب اور آمادہ تھا ۔ نہیں معلوم، آج اسٹیشن کب آئے! اور آئے بھی تو اس کا اطمینان کیونکر ہو کہ عبداللہ کی آمد کا قاعدۂ کلیہ آج ہی بحالتِ استثنا نمودار نہ ہو گا! میں نے دیا سلائی اٹھائی اور چولھا روشن کر دیا ۔ اب چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں ۔ مقصود اس تمام درازنفسی سے اس کے سوا کچھ نہیں

کہ مخاطبت کے لیے تقریبِ سخن ہاتھ آئے:

نفسے بیادِ تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابو نواس والی بات ہوئی کہ:

رق الزجاج ورقت الخمر

فتشابھا، فتشاکل الامر

کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اس کا ہر فنجان نشأۂ ثانی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے:

ساقی بدہ رطلِ گراں، زاں مے کہ دہقاں پرورد

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکّب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لونگا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہونگا۔ علمی اصطلاح میں اس صورتِ حال کو علیٰ سبیل التوالی والتعاقب کہیے۔ اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حُسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ اِدھر فنجان آخری جُرعہ سے خالی ہوا، اُدھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزائے تُند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے فیضی کے الفاظ مستعار لوں:

اعتدالِ معانی از من پُرس

کہ مزاجِ سخن شناختہ ام

آپ کہینگے، چائے کی عادت بجائے خود ایک علّت تھی؛ اس پر مزید علّت ہائے نافرجام کا

اضافہ کیوں کیا جائے؟ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا۔ علّتوں پر علّتیں بڑھانا، گویا حکایتِ بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کرونگا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلا شبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں۔ لیکن کیا کہوں! جب کبھی معاملے کے اس پہلو پر غور کیا، طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کی غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگارِ خراب میں زندگی کو بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرنی چاہییں:

پیرِ ما گفت، خطا در قلمِ صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاک خطا پوششِ باد!

غور کیجیے، وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامنِ خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے! وہ چال ہی کیا، جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو!

تو و قطعِ منازلہا، من و یک لغزشِ پائے

اور اگر پھر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے، تو سارا معاملہ بالآخر وہیں جا کر ختم ہو جائیگا، جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہمچو توئی یا بفسقِ ہمچو منی

اور اگر پوچھیے کہ پھر کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہوا، اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں؟ تو اس کا جواب وہی ہے جو عرفاءِ طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

ترکِ ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش

یعنی ترک و اختیار، دونوں کا نقشِ عمل اس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں، مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے الجھنا مخل نہیں ہوتا، دامنگیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے، تو بھیگنے دیجیے۔ لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا، اس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے، بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تر دامنی کی گرانی محسوس کیجیے، نہ خشک دامنی کی سبک سری، نہ آلودہ دامنی پر پریشان حالی ہو، نہ پاک دامنی پر گرانی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
رُوئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

آپ کو ایک واقعہ سُناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کُھل جائے۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا، تو مجھے معلوم تھا کہ قیدخانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیر اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اُسے جیب میں رکھ لوں؛ پھر صورت حال کا احساس ہوا تو رُک گیا۔ لیکن پولیس کمشنر نے، جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، بہ اصرار کہا کہ ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگریٹ تھے۔ ایک کمشنر پولیس کے آفس میں پیا، دو سرا راستہ میں سلگایا، دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ باقی چھ رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا، اس جیب کے وبال سے سُبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں، تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا، اور پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جن کے پاس سگریٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے اور قیدخانہ کا احتساب عمداً چشم پوشی کرتا تھا۔ بعض "شرب الیہود"[۵] کا طریقہ کام میں لاتے تھے:

شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

۵۔ اسلامی حکومتوں میں یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے اور بیچتے تھے، اس لیے پوشیدہ شراب پینے کے معنی میں "شرب الیہود" کی اصطلاح رائج ہو گئی۔

بعضوں کی جرأتِ رندانہ اس بند و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ:

ولا تسقنی سراً، فقد امکن الجہر ۵

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنی توبۂ اضطرار پر بھی پشیمان نہیں ہوا کئی مرتبہ گھر سے سگریٹ کے ڈبے آئے اور میں نے دوسروں کے حوالے کر دیے!

خوشم کو توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد

سرگزشت کا اصلی واقعہ اب سنیے۔ جس دن علی الصّباح مجھے رہا کیا گیا، تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا، اور از راہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجئے جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا، اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی، نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہوا تھا، نہ حصول پر نشاط ہوا۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزا دیا تھا' وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریفِ صافی و دُردی نہ خطا ایں جاست
تمیز ناخوش و خوش می کنی، بلا ایں جاست

۱۹۲۱ء کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا، لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے، مگر روکے نہیں گئے اگر روکے جاتے، تو پھر ترک کر دیتا۔

اب قلم کی سیاہی جواب دینے لگی ہے اس لیے رُک جاتا ہوں:

قلم ایں جا رسید و سر بشکست

ابوالکلام

---

۵ پورا شعر یہ ہے

الا فاسقنی خمراً و قل لی ھی الخمر   ولا تسقنی سراً فقد امکن الجہر

(مجھے شراب پلا یہ کہہ کر کہ یہ شراب ہے۔ مجھے چھپا کر نہ پلا کیونکہ اب کھل کر پینا ممکن ہو گیا ہے)

(۲)

داستانِ بے ستون و کوہ کن

قلعۂ احمد نگر

۱۰ اگست ۱۹۴۲ء

از ساز و برگ قافلۂ بے خوداں مپرس
بے نالہ می رود جرس کاروانِ ما!

صدیقِ مکرّم

کل صبح تک وسعت آبادِ بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مایگی کا یہ حال تھا کہ ۳ اگست کا لکھا ہوا مکتوب سفر بھی اجمل خان صاحب کے حوالہ نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعۂ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں:

وسعتے پیدا کن، اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند

نو مہینے ہوئے، ۴ ستمبر کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو ساڑھے دس بجے قلعۂ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم

ہوتی :

دو کروڑیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے "تاریخ کی ایک پوری داستان گذر چکی :

چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کرے گا!

فریب جہاں قصۂ روشن است

بہ بیں تا چہ زاید، شب آبستن ست

۴ اگست کو بمبئی پہنچا، تو انفلوئنزا کی حرارت اور سرگرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو، لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷ اگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے ؛ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی، کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا، لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ کو ۲ بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک بیٹھنا پڑا، لیکن کارروائی ختم کر کے اٹھا :

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ

ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحب مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصہ سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں اُن سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا، تاکہ اُن کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفا منظور بھی نہیں کیا ہے، لیکن انھیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے: فلاں شخص شام کو آیا تھا، کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لیے گئے

ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئیگا۔ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں
دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا:

یا وفا، یا خبرِ وصلِ تو، یا مرگ رقیب
بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ اُن کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجلا کر کہا: "جس طرح کے حالات درپیش ہیں۔ ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اُڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا! اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جواب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے، اور چند گھنٹے آرام کر لوں؟

گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم!

حسبِ معمول چار بجے اُٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین (Genaspirin) کی دو گولیاں منھ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوط کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روزویلیٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا، اور اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہو گا، کچھ نسیم صبحگاہی کے ان شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کر دی:

نسیمِ صبح! تیری مہربانی

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا، لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی ہیں اور اس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے، اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا میں خواب دیکھ رہا

ہوں، اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا۔

زہے مراتبِ خوابے کہ بہ ز بیداری ست

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گزرے ہونگے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لیے کافی تھی۔ مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں :

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی !

میں نے دھیرو سے کہا: مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگیگا۔ اُن سے کہہ دو انتظار کریں۔ پھر غسل کیا کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے، اور باہر نکلا تو پانچ بج کر بنتالیس منٹ ہوئے تھے:

کار مشکل بود ما بر خویش آساں کردہ ایم !

کار باہر نکلی، تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے، اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آگئی :

صبا وقتِ سحر بوئے ز زلفِ یار می آورد
دلِ شوریدۂ ما را ز نو در کار می آورد

کار وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی، تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا۔ اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گزر رہا تھا۔ لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی، کیونکہ ایک انجن رسٹورنٹ کار کو ڈھکیل ڈھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا، یہی کاروانِ خاص ہے، جو ہم زندانیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈور کیریج (Corridor carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جڑ جاتی ہیں، اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک

اندر ہی اندر چلا جاتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا، گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت
کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں؛ جو نہیں آئے، وہ آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے، ان کے چہروں پر بےخوابی اور ناوقت کی بیداری
بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا بمشکل
ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ میں نے کہا معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؛
اسے بھی کوئی جگانے کے لیے پہنچا یا نہیں؟

درازیِ شب و بیداریِ من، ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید — تا کجا خفتست !

بہرحال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہوسکتی تھیں۔ چونکہ رسٹورنٹ کار
لگ چکی تھی اور چائے کے لیے پوچھا گیا تھا، اس لیے گو پی چکا تھا، لیکن پھر منگوائی اور ران
نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جامِ صبحگاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار مٹائیں:

بنوش مے چو سبک روحی، اے حریف مدام
علی الخصوص دریں دم کہ سرگراں داری

یہاں "بادۂ دوشینہ" کی ترکیب محض "جامِ صبحگاہی" کی مناسبت سے زبانِ قلم پر طاری ہو
گئی۔ مگر غور کیجیے، کتنی مطابقِ حال واقع ہوئی ہے! صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورتِ
حال کیسی منقلب ہوگئی! کل شام کو جو بزمِ کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ
گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا۔ لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے
تو:

نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی، اور مجلسِ دوشین کی دست فشانیوں
اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی، تو اب صبح خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوا اور کچھ باقی
نہیں رہا تھا:

خمیازہ سنج تہمتِ عیشِ رمیدہ ام
مے آں قدر نہ بود کہ رنجِ خمار برد

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی بے سیتوں کے بعد اب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا، تو ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا، تو کاش جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی، اور ننھے ننھے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیے ہوتے! خواجہ میر دردؔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رندِ شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی آیا:

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں، ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی اور پونا کی راہ اختیار کی، تو سب کو خیال ہوا غالباً منزلِ مقصود پونا ہی ہے، لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقاء اتار لیے گئے، اور بمبئی کے مقامی قافلے کو بھی اترنے کے لیے کہا گیا مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا، اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا، کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے، تو پھر اس رخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسّی میل سے زیادہ نہیں، اس لیے زیادہ سے

زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا۔ احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے، بہت جلد آ جائیگا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے، احمد نگر سے تو شروع ہوگا۔ بے اختیار ابوالعلاء معرّی کا لامیّہ یاد آ گیا:

فیا دارہا بالخیف، إنّ مزارہا
قریبٌ ولکن دون ذالک اہوالُ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے، مگر قلعۂ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا، تو قصد بھی کیا تھا، مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی، تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے عَلَمِ استقلال بلند کیا، اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اُسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دار الحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندران سے آکر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے، چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کر لی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا:

کس پایمالِ آفتِ فرسودگی مباد
دیروز ریگِ بادیہ آئینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اوّل نے اسے منہدم کر کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کیا، اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلاب سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے،

جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے:

کار داں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہ ہر راہگذر افتادست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے:

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حال اہل شوکت بیں
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خان خاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خان لودی نے پوچھا تھا: چنیں انبوہے در پیش [است] و فتح آسمانی۔ اگر (شکست) رو دہد، جائے نشاں دہید کہ [ما] شمارا دریابیم"۔ خانخاناں نے جواب دیا تھا:" زیر لاشہا"۔

وَنَحْنُ اُناسٌ لا توسّط بیننا
لنا الصّدرُ دونَ العالمین اَو القبرُ

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا۔ اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہن لیے ورق بر ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا:

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چُنی گئی ہے، تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خراباتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

با یک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے، انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اُترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اُٹھا دیا، تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں، لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

ہاں رہِ عشق ست، کج گشتن ندارد باز گشت

جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست!

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہو گی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلے پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اُس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے اور اس میں جو قلعہ کے اندر ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجیے، تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا:

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ

دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابو الفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ولیزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے، اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی، وہ

بھی اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔
قلعے کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی، پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطے کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لیے چڑھائی پر واقع ہے، کاریں رُک گئیں اور ہمیں اُترنے کے لیے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس، بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کی، وہ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سررشتہ حکومت بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہوگئے:

در جستجوے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا، غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے، اور بیچ میں کھلی جگہ ہے، یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے، تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلیگا تو محسوس کریگا کہ کھلی جگہ میں آگیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے:

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے، مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لیے سر اُٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

یہیں ملینگے تجھے نالۂ بلند ترے

احاطہ کے شمالی کنارے میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں

اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے، مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا:

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے! چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہرحال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی؛ ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی تھیں، وہیں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سبحان اللہ! اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں! اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لیے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو!

کشتوں کا تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی، تو خرابات ہوویگا!

مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہوگیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

ما گوشہ را نہ بہرِ قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو ۹ بجے تکیہ پر سر رکھا، تو صبح تین بجے آنکھ کھولی:

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تین بجے اٹھا، تو تازہ دم اور چست و چاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی، نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا۔ اور چائے دم دی۔ اب جام و صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصور کرتا ہوں اور یہ داستان بے ستون و کوہکن

سنا رہا ہوں :

شیریں ترا ز حکایت ِ ما نیست قصہ

تاریخ ِ روز گار سراپا نوشتہ ایم

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا، تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی ۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے :

غلط گفتنی: "چرا سجادہ تقوی گرد گردی؟

بزُ ہد آلودہ بودم، گر نمی کردم، چہ می کردم؟"

یہ اسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر، جو مجتہد ِ کاشان کی نسبت کہا تھا، بہت مشہور ہو چکا ہے :

ز شیخ شہر جاں بُردم بہ تزویر مسلمانی

مدارا گر باایں کافر نمی کردم، چہ می کردم؟

ردیف کا بنھانا آسان نہ تھا مگر دیکھیے کس طرح بول رہی ہے ! بول نہیں رہی ہے، چیخ رہی ہے ۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں، اور اس کا مطلع دہرا رہا ہوں :

ز ساغر گر دماغے تر نمی کردم، چہ می کردم؟

خدارا، داد دیجیے ۔ نظر بہ حالت ِ موجودہ یہاں "چہ می کردم" کیا قیامت ڈھا رہا ہے! گویا یہ مصرع خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا ۔ مگر یوں پتہ نہیں چلیگا، "چہ می کردم" پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھیے ۔ پھر دیکھیے، صورت ِ حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے ۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلیتہ گو یی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے ۔ یہ بھی نہیں معلوم بحالت ِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکینگی یا نہیں! تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا ۔ یہ وہی حالت ہوئی، جسے مرزا غالب نے ذوق ِ خامہ فرسا

کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا!

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ابوالکلام

(۳)

قلعۂ احمد نگر

۱۷ ڈسمبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

وقت وہی ہے، مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے، جو طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہو گئی، اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں؛

یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدم

ویراں شود آں شہر کہ میخانہ ندارد

مجبوراً ہندستان کی اسی سیاہ پتّی کا جوشاندہ پی رہا ہوں، جسے تعبیر و تسمیّہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ:

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں!

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر

زیں رسم ہا کہ مردمِ عاقل نہادہ اند

اس کارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ

صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ دُردِ کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا، اور خندۂ بہار کے پیچھے گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے: قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند، و صفحہ تمام نہ شد کہ ورق بر نہ گردید:

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال
چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

امید ہے کہ آپ کی "عنبریں" چاے کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا:

امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نہ باشی
مے خوردنِ ہر روزہ ز عاداتِ کرم است

معلوم نہیں، کبھی اس مسئلہ کے دقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی ہے، یا نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں! واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی طبیعت کبھی سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی، زمانے کی بیراہ رویوں کا ہمیشہ ماتمگسار رہنا پڑا۔

ازاں کہ پیرویِ خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست

چاے کے باب میں ابناے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی، بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا یعنی اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

سب سے پہلا سوال چاے کے بارے میں خود چاے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چاے کو چاے کے لیے پیتا ہوں، لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی ان کے لیے وسائل میں۔ غور فرمائیے، میرا رُخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے!

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

چاے چین کی پیداوار ہے، اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جارہی ہے، لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب خیال میں بھی یہ بات نہیں گزری کہ اس جوہرِ لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جاسکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہِ راست گئی، مثلاً روس، ترکستان، ایران ــــ وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گذرا۔ مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے، تو نہیں معلوم، ان لوگوں کو کیا سوجھی، انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی۔ اور چونکہ ہندستان میں چاے کا رواج انھیں کے ذریعہ ہوا، اس لیے یہ بدعتِ سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چاے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چاے ڈالنے لگے۔ بنیادِ ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر کہ آمد، برآں مزید کرد! اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہوگئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے، لیکن اُن کے تخمِ فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیے ہیں، انھیں کون چھانٹ سکتا ہے! لوگ چاے کی جگہ ایک طرح کا سیّال حلوہ بناتے ہیں، کھانے کی جگہ پیتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چاے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ:

ہاے کمبخت! تو نے پی ہی نہیں

پھر ایک بنیادی سوال چاے کی نوعیت کا بھی ہے اور اس بارے میں بھی ایک عجیب عالمگیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیے اور کس کس کو سمجھائیے:

روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد

عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتّی کو جو ہندستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے، سمجھتے ہیں، چاے ہے، اور پھر اس کی مختلف قسمیں کرکے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے بارے میں باہم ردّ و کد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے: سیلون کی چاے بہتر ہے؛ دوسرا کہتا ہے: دارجلنگ کی بہتر ہے۔ گویا یہ بھی وہ معاملہ ہوا کہ:

در رہِ عشق نشد کس بیقین محرمِ راز
ہر کسے برحسب فہم گمانے دارد

حالانکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں:

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

دراصل یہ عالمگیر غلطی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے، اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا، مگر تقریباً اسی شکل وصورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا، اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے، اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے:

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنسِ کمیاب ارزاں ہو، بے سمجھے بوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی، اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب یہ ہزار سر پیٹیے، سنتا کون ہے:

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پُرسشِ دادخواہاں نہیں

معاملہ کا سب سے دردانگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالمگیر فریب کی لپیٹ میں آگئے، اور اسی پتی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لال پتھر کو لعل سمجھا، اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھاس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کر دیں:

چو کفر از کعبہ برخیزد و کجا ماند مسلمانی

نوعِ انسان کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے۔ جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اکّا دکّا ہوگا، بھیڑ بیوقوفوں ہی کی رہیگی۔ ماننے پر آئینگے تو گائے کو خدا مان لینگے، انکار پر آئینگے، تو مسیح کو سولی پر چڑھا دینگے۔ حکیم سنائی زندگی بھر ماتم کرتا رہا:

گاو را دارند باور در خدائی عامیاں
نوح را باور ندارند از پے پیغمبری

اسی لیے عرفاے طریق کو کہنا پڑا:

انکارِ خلق باش، تصدیق انیست — مشغول بہ خویش باش، توفیق انیست
تبعتِ خلق از حقّت باطل کرد — ترکِ تقلید گیر، تحقیق انیست

یہ تو اصول کی بحث ہوئی؛ اب فروع میں آئیے۔ یہاں بھی کوئی گوشہ نہیں، جہاں زمین ہموار ملے۔ سب سے اہم مسئلہ شکر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اور نوعیّت کے لحاظ سے بھی:

درد اکہ طبیب صبر می فرماید
ویں نفسِ حریص شکری باید

جہاں تک مقدار کا تعلّق ہے، اسے میری محرومی سمجھیے، یا تلخکامی کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصّہ ملا ہے۔ نہ صرف چاے میں، بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں کرسکتا۔ دنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی، وہی میرے لیے بدمزگی ہوگئی۔ کھاتا ہوں تو منھ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذّت مٹھاس میں ملتی ہے، مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہوا ہے، مگر میں اوپر سے چھڑک دونگا۔ میں صباحت کا نہیں، ملاحت کا قتیل ہوں:

وللناس فی ما یعشقون مذاھب

گویا کہہ سکتا ہوں کہ "اخی یوسف اصبح وانا املح منہ" کے مقام کا لذّت شناس ہوں:

گر نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو این حکایت

اس حدیث کے تذکرہ نے یارانِ قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلائی کہ الایمان حلوٌ والمومن یحب الحلوی ؎ لیکن اگر مدارجِ ایمانی کے حصول اور مراتبِ ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا، تو نہیں معلوم، ان تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے، جن کی محبّتِ حلاوت کی ساری پونجی چاے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی اور پھر اس کم شکر پر بھی تاسّف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہا، مولانا شبلی مرحوم کا بہتر بن شعر یاد آگیا:

دودل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم زکفرِ خود کہ دارد بوے ایماں ہم

بچّوں کا مٹھاس کا شوق ضرب المثل ہے، مگر آپ کو سُن کر تعجّب ہوگا کہ میں بچپنے میں بھی مٹھاس کا شائق نہ تھا۔ میرے ساتھی مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ تجھے نیم کی پتّیاں چبانی چاہییں اور ایک مرتبہ پیسی ہوئی پتّیاں کھلا بھی دی تھیں:

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جاے لذّت آشنا تلخیِ دوراں سے

میں نے یہ دیکھ کر کہ مٹھاس کا شائق نہ ہونا نقص سمجھا جاتا ہے، کئی بار تہ تکلّف کوشش کی کہ اپنے آپ کو شائق بناؤں، مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ گویا وہی چندر بھان والی بات ہوئی کہ:

مرا دلے ست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

بہر حال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا، مگر معاملہ اس پر کہاں ختم ہوتا ہے:

کوتہ نظر ببیں کہ سخن مختصر گرفت

؎ یعنی ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے وہ مٹھاس کو محبوب رکھیگا۔

ایک دقیق سوال اس کی نوعیت کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جاسکتی ہے، وہی چاے میں بھی ڈالنی چاہیے؛ اس کے لیے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دالوں کی دوبارہ شکر جو پہلے جاوا اور موریشیس سے آتی تھی، اور اب ہندستان میں بننے لگی ہے، چاے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے؛ حالانکہ چاے کا معاملہ دوسری چیزوں سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ اسے حلوے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا مزاج اس قدر لطیف اور بے میل ہے کہ کوئی بھی چیز جو خود اسی کی طرح صاف اور لطیف نہ ہوگی، فوراً اسے مکدّر کر دیگی۔ گویا چاے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ:

نسیمِ صبح جو چھو جاے رنگ ہو میلا

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کیے ہوے رَس سے بنتی ہے، مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چاے میں ڈالیے، معاً اس کا ذائقہ متاثر اور لطافت آلودہ ہو جائیگی۔ اگرچہ یہ اثر ہر حال میں پڑتا ہے، تاہم دودھ کے ساتھ پیجیے، تو چنداں محسوس نہیں ہوتا، کیونکہ دودھ کے ذائقہ کی گرانی چاے کے ذائقہ پر غالب آجاتی ہے، اور کام چل جاتا ہے، لیکن سادہ چاے پیجیے تو فوراً بول اٹھیگی۔ اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے، اور بڑے دانوں کی شکل میں بھی۔ میں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفاف شکر کام میں لاتا ہوں اور اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالب گلاب سے لیا کرتے تھے:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خُوے اُوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

میرے لیے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا، جیسے شربت پینے والوں کے لیے قند اور گڑ کا فرق ہوا۔ لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ جس کسی سے کہا، اس نے یا تو اسے مبالغہ پر محمول کیا، یا میرا وہم و تخیل

سمجھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو میرے ہی منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے، یا دنیا میں کسی کے منہ کا مزہ درست نہیں۔ یہ نہ بھولیے کہ بحث چائے کے تکلّفات میں نہیں ہے، اس کی لطافت و کیفیت کے ذوق و احساس میں ہے۔ بہتیرے لوگ چائے کے لیے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں ہی کا رواج ہے، مگر یہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ چائے کے ذائقہ کے لیے یہ کوئی ضروری چیز ہوئی، بلکہ محض تکلّف کے خیال سے کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتاً قیمتی ہوتی ہے۔ آپ انھیں معمولی شکر ڈال کر چائے دے دیجیے، بے غل و غش پی جائینگے اور ذائقہ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرینگے۔

شکر کے معاملے میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا، تو وہ ایرانی ہیں۔ اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں، مگر یہ نکتہ انھوں نے پالیا ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آئی تھی کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے، اور اسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے، کیونکہ قند صاف ہوتی ہے، اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کا کیا حال ہے! اور اگر "تعریف الاشیاء باضدادہا" کی بنا پر پوچھیے کہ چائے کے معاملہ میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہوا؟ تو میں بلا تامّل انگریزوں کا نام لونگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منّت پذیر ہے، تاہم یہ نزدیکانِ بے بصر حقیقتِ حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انھیں چھو بھی نہیں گیا۔ جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلّدوں کا جو حال ہوگا، معلوم ہے:

آشنا را حال این ست، وائے بر بیگانہ

انھوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا، مگر اور کچھ سیکھ نہ سکے۔ اوّل تو ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتّی ان کے ذوقِ چائے نوشی کا منتہائے کمال ہوا۔ پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے یک قلم گندہ کر دینگے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے

کہ اس گندے مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرینِ فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔ کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چاے نوشی سے مقصود انہی پتّیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے، تو اس کے لیے ماہرینِ فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے! جو پتّی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے، اور ایک تیز بُو پیدا ہو جائے، چاے ہے! اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چاے کا ایک ماہرِ فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائیگا!

ہیں یہی کہنے کو وہ بھی، اور کیا کہنے کو ہیں؟

اگرچہ فرانس اور برِّ اعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہوا، تاہم اعلیٰ طبقہ کے لوگ چاے کا بھی شوق رکھتے ہیں، اور ان کا ذوق بہرحال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چاے پییں گے، اور اگر سیاہ چاے پییں گے بھی، تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے یا لیموں کی ایک قاش کے ساتھ، جو چاے کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچاتی، بلکہ اور نکھار دیتی ہے۔ یہ لیموں کی ترکیب دراصل روس، ترکستان اور ایران سے چلی۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چاے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا۔ بعض ایرانی بھی دَور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں۔ یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے:

سرِ این فتنہ ز جائیست کہ من می دانم

اب اِدھر اک اور نئی مصیبت پیش آگئی ہے۔ اب تک تو صرف شکر کی عام قسم ہی کے استعمال کا رونا تھا، لیکن اب معاملہ صاف صاف گڑ تک پہنچنے والا ہے۔ ہندوستان قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا، تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کر کے لال شکر بنانے لگے تھے۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دُور تھی، مگر ناصاف گڑ سے ایک قدم آگے نکل آئی تھی۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی، تو اس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا؛ لیکن اب پھر دنیا اپنی ترقی معکوس میں اسی طرف لوٹ رہی ہے، جہاں سے سیکڑوں برس پہلے آگے بڑھی تھی۔ چنانچہ

آج کل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اہلِ ذوق کہتے ہیں، کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی اور جیسا کہ قاعدہ مقرر ہے، اب اُن کی تقلید میں یہاں کے اصحابِ ذوق بھی "براؤن شوگر" کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشنگوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ براؤن شوگر کا ہلکا سا پردہ بھی اُٹھ جائیگا اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائیگی۔ یارانِ ذوقِ جدید کہینگے کہ گُڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے نہ کافی۔ فرمائیے اب اس کے بعد باقی کیا رہ گیا ہے، جس کا انتظار کیا جائے؟

وائے، اگر درپسِ امروز بود فردا ئے!

شکر اور گڑ کی دنیائیں اس درجہ ایک دوسری سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسری کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھا لیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر اُن میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں، اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس درجہ نمایاں ہے، انھیں بھی محسوس کراؤں، لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کے رہ گیا۔

بہرحال زمانہ کی حقیقت فراموشیوں پر کہاں تک ماتم کیا جائے:

کوتہ نہ تواں کرد کہ ایں قصّہ دراز ست!

آیئے، آپ کو کچھ اپنا حال سناؤں۔ اصحابِ نظر کا قول ہے کہ حُسن اور فن کے معاملہ میں حُبّ الوطنی کے جذبہ کو دخل نہیں دینا چاہیے:

متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد

پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی چائے کے باب میں شاہدانِ ہند کا نہیں، خوبانِ چین کا معتقد ہوں:

دوائے دردِ دلِ خود ازاں مفرح جُوے
کہ در صراحیِ چینی و شیشہ حلبی ست

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل چنگ کائی شک اور

میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے، بلکہ اس لیے کہ چاے وہیں سے آتی ہے:

مے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار

ما ندانیم کہ بسطامے و بغدادے ہست

ایک مدت سے جس چینی چاے کا عادی ہوں، وہ "وہائٹ جیسمین (WHITE JASMINE) کہلاتی ہے یعنی "یاسمن سفید" یا ٹھیٹ اُردو میں یوں کہیے کہ "گوری چنبیلی":

کسے کہ محرمِ رازِ صباست، مے داند

کہ باوجودِ خزاں بوے یاسمن باقیست

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے، اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں! لوگوں نے آتش سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے:

مے میان شیشۂ ساقی نگر

آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چاے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے، جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کرکے بلورین فنجان میں گھول دی ہوں۔ ملّا محمد مازندرانی صاحب بت خانہ نے اگر یہ چاے پی ہوتی، تو خانخاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا:

نہ می ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب

تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہوئی، تو اس کا اثر چاے پر بھی پڑا۔ میں کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے منگوایا کرتا تھا، اس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبے مل گئے تھے، اور بعض چینی دوستوں نے بطورِ تحفہ کے بھی بھیج کر چارہ سازی کی تھی۔ جب کلکتہ سے نکلا، تو ایک ڈبہ ساتھ تھا، ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئی سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا، تو سامان کے ساتھ وہ بھی آگیا اور پھر قبل اس کے کہ ختم ہو، گھر والا

ڈبہ بھی پہنچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی کمی محسوس ہوئی ہو، لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی، تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی:

حافظ! دگر چہ می طلبی از نعیم دہر
مے می خوری و طرّہ دلدار می کشی

اس کی فکر کبھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبہ چلیگا کب تک! کیونکہ خواجۂ شیراز کی موعظت ہمیشہ پیشِ نظر رہتی ہے:

تا ساغرت پرست، بنوشان و نوش کُن

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں۔ اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دودھ اور دہی کی دنیا چائے کی دنیا سے کتنی دُور واقع ہوئی ہے! عمریں گزر جائیں، پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی کہاں چائے کے ذوقِ لطیف کا شہرستان کیف و سرور اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں!

جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں، خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی۔ لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے، شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور اپنی لیپچو دیپچوہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا نہ صرف بیسود تھا، بلکہ "وضع الشی فی غیر محلہ" کے حکم میں داخل تھا:

مے بہ زہاد مکن عرضہ کہ ایں جوہرِ ناب
پیش ایں قوم بہ شورا بۂ زمزم نہ رسد

ان حضرات میں سے صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر

کرتے ہوئے یہ چاے پی تھی، اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے، مگر اچھی ہے۔ یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا، جو وہ روز پیا کرتے ہیں، مگر یہ بھی چنداں بری نہیں۔ زمانے کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے، یہ ان کی صرف "اچھی ہے" کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انھیں بلا لیا کرتا تھا کہ آیئے، ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجیے:

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

ان کے لیے یہ صرف "اچھی" ہوئی۔ یہاں چاے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے، اگر یہ "اچھی ہے" ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہ گیا ہے:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں

ہیں، نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم!

مگر ایک ڈبہ کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہو جانے پر آیا۔ چیتہ خان نے یہاں دریافت کرایا، پونا بھی لکھا، لیکن اس قسم کی چاے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے۔ دیکھیے، کیا نتیجہ نکلتا ہے! ایک ہفتہ سے وہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پر جی رہا ہوں:

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را

اے بہ ترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل!

آج کل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوراں کھل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے، اس لیے یہاں بھی ایک چینی رسٹوراں کھل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چاے ضرور ہوگی۔ اس نے خالی ڈبہ بھیج کر دریافت کرایا۔ انھوں نے ڈبہ دیکھتے ہی کہا کہ یہ چاے اب کہاں مل سکتی ہے! لیکن تمھیں یہ ڈبہ کہاں سے ملا؟ اور اس چاے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آ رہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا، اس نے ہر چند باتیں بنائیں مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چینگ

کائی شیک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آرہی ہے اور اس کے لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جارہا ہے:

ببیں کہ نقشِ اَملہا چہ باطل افتادست

چائے کے ڈبّے کی تہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتّیوں کا چورا بیٹھ جایا کرتا ہے، اور اُسے ڈبّے کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبّہ ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا اُس کی تہ میں بھی جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں! لیکن چینیہ خان نے دیکھا، تو کہا: آج کل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے۔ یہ چورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے؟ میں نے بھی سوچا کہ:

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست، دم دَرکش
کہ ہر چہ ساقیِ ما ریخت، عین الطاف ست

چنانچہ یہ چورا بھی کام میں لایا گیا اور اس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر تیار رہا۔ جب فنجان میں چائے ڈالتا تھا، تو ان ذرّوں کی زبانِ حال پکارتی تھی:

ہر چند کہ نیست رنگ و بُو ہم
آخر نہ گیاہِ باغِ اُو ییم

اس تخیّل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف و سرور کا جام لے رہا ہوں، توسنِ فکر کی جولانیوں کے لیے "تازیانہ" کا کام دیا، اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ ہا! مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا:

اگر دماغِ غم دریں شبستاں، خمارِ شرمِ عدم نگیرد
زخشکِ ذرّہ جام گیرم، بآں شکوہے کہ جم نگیرد
دریں قلمرو کفِ غبارم، بہ ہیچ کس ہمسری ندارم
کمالِ میزانِ اعتبارم، ہمیں ست اگر ذرّہ کم نگیرد

اس تجربے کے بعد بے اختیار خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سرجوشِ خُم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں، تو کاش، اس تہِ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں!

غالب نے کیا خوب کہا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
یوں ہے کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

شکر کے مسئلہ نے بھی یہاں آتے ہی سر اُٹھایا تھا، مگر مجھے فوراً اس کا حل مل گیا، اور اب اس طرف سے مطمئن ہوں۔ موٹے دانوں کی شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ جب ختم ہو گئی، تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مل جائیگی نہیں ملی تو ٹولیوں کے بکس تو ضرور مل جائینگے لیکن جب بازار میں دریافت کرایا، تو معلوم ہوا امن کے وقتوں میں بھی یہاں ان چیزوں کی مانگ نہ تھی اور اب کہ جنگ کی رکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں، ان کا سراغ کہاں مل سکتا ہے! مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اسے کٹوا کر شکر کی طرح کام میں لاؤں، لیکن کوٹنے کے لیے ہاون کی ضرورت ہوئی، جیلر سے کہا، ایک ہاون اور دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کبھی کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں!

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر
بسر نہ کوفتہ باشد درِ سرائے را

مجبوراً میں نے ایک دوسری ترکیب نکالی۔ ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں اور بہت سارڈی کا غذ او پر تلے دھر دیا۔ پھر ایک پتھر اٹھا کر ایک قیدی کے حوالے کیا جو یہاں کام کاج کے لیے لایا گیا ہے کہ اپنے سر کی جگہ اسے پیٹ:

دریں کہ کوہکن از ذوق داد جاں چہ سخن
ہمیں کہ تیشہ بسر دیر زد، سخن باقی ست

لیکن یہ گرفتارِ آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا!

کہ ایک چوٹ بھی قرینہ کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کٹنے سے رہی، البتہ کاغذ کے پُرزے پُرزے

اُڑ گئے اور کپڑے نے بھی اُس کے رُوئے صبیح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا:

چلی تھی برچھی کسی پر، کسی کے آن لگی!

بہر حال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا "زشت" اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا انگھڑ ظرف نظر سے نہیں گزرا تھا آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسطِ ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں، یہ ہاون بھی اسی قبیلے کی دست کاریوں کا بقیہ ہو، اور اس انتظار میں گردشِ لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعۂ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے، اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انھیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے:

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

خیر کچھ ہو، مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی؛ لیکن اب کٹی ہوئی مصری موجود ہے، تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے:

اگر دستے کنم پیدا، نمی یابم گریباں را

دیکھیے، صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہوگئی، مگر بائیس صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی:

یک حرف بیش نیست سراسر حدیثِ شوق
ایں طُرفہ تر کہ ہیچ بہ پایاں نمی رسد!

ابوالکلام

(۴)

چڑیا چڑے کی کہانی

قلعۂ احمد نگر

۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں۔ خود زندگی ایسی گذری جیسے ایک کہانی ہو۔

ہے آج جو سرگذشت اپنی کل اس کی کہانیاں بنینگی

آئیے، آج آپ کو چڑیا چڑے کی کہانی سناؤں:

دگرہا شنیدستی، ایں ہم شنو

یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جا بجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے، اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہوگئیں۔ دن بھر اُن کا ہنگامۂ تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے، اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں؛ یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ

ہم بیاباں میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے

گذشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے، ان چڑیوں کی آشیاں سازیوں نے بہت پریشان کر دیا تھا۔ کمرہ کے مشرقی گوشے میں مُنھ دھونے کی ٹیبل لگی ہے۔ ٹھیک اُس کے اوپر، نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلا تعمیر پا چکا تھا۔ دن بھر میدان سے تنکے چُن چُن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں۔ وہ ٹیبل پر گر کے اسے کوڑے کرکٹ سے اَٹ دیتے۔ ادھر پانی کا جگ بھروا کے رکھا، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پچھم کی طرف چارپائی دیوار سے لگی تھی، اس کے اوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کر دینے والا تھا۔ اِن چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے، اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں، لیکن طلب و سعی کا جوش اس بلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کر دینگی۔ حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے (Dos moi pau sto kai ten gen kineso) مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دو، میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دونگا۔ اس دعوے کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنا لینگی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے۔ پھر اس پر پنجے جما کر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کر دینگی، اور اس زور سے چلائینگی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کا نپنے لگیگا؛ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے، تو کئی انچ کلفات اُڑ چکی ہو گی۔ مکان چونکہ پُرانا ہے۔ اس لیے نہیں معلوم کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں۔ یہ اب مل ملا کر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دَل بن گیا ہے۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دُھواں پھیل جاتا ہے؛ اور کپڑوں کو دیکھیے، تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں۔

اس مصیبت کا علاج بہت سہل تھا، یعنی مکان کی از سرِ نو مرمّت کر دی جائے، اور تمام گھونسلے بند کر دیے جائیں؛ لیکن مرمّت بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ معمار بلائے جائیں اور یہاں باہر کا کوئی آدمی اندر قدم رکھ نہیں سکتا۔ یہاں ہمارے آتے ہی پانی کے نل بگڑ گئے تھے۔ ایک معمولی مستری کا کام تھا؛ لیکن جب تک ایک انگریز فوجی انجینیر کمانڈنگ آفیسر کا پروانہ راہداری لے کر نہیں آیا، ان کی مرمّت نہ ہو سکی۔

چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا، لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا، اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں:

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آگئی ہے، میں نے اٹھائی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا، کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آگیا:

خیالِ قدِ بلندِ تو می کند دلِ من
تو دست کوتہٗ من بین و آستینِ دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کچھ نہ پوچھیے کہ میدانِ کارزار میں کس زور کا رن پڑا۔ کمرہ میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجز بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے:

بہ خنجر زمیں را میستاں کنم
بہ نیزہ ہوا را نیستاں کنم

آخر میدان اپنے ہاتھ رہا، اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ ان حریفانِ سقف و محراب سے بالکل صاف تھا:

بیک تاختن تا کجا تاختم
چہ گردن کشاں را سر انداختم

اب میں نے چھت کے تمام گوشوں پر فتحمندانہ نظر ڈالی، اور مطمئن ہو کر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن ابھی پندرہ منٹ بھی پورے نہیں گزرے ہونگے کہ کیا سنتا ہوں، حریفوں کی رجز خوانیوں اور ہوا پیمائیوں کی آوازیں پھر اٹھ رہی ہیں۔ سر اٹھا کے جو دیکھا تو

چھت کا ہر گوشہ اُن کے قبضہ میں تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور بانس لاکر پھر معرکۂ کارزار گرم کر دیا:

برآرم دیار از ہمہ لشکرش
بہ آتش بسوزم ہمہ کشورش

اس مرتبہ حریفوں نے بڑی پامردی دکھائی۔ ایک گوشہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے، تو دوسرے میں ڈٹ جاتے، لیکن بالآخر اُن کو پیٹھ دکھانی ہی پڑی۔ کمرہ سے بھاگ کر برآمدہ میں آئے اور وہاں اپنالاؤلشکر نئے سرے سے جمانے لگے۔ میں نے وہاں بھی تعاقب کیا۔ اور اس وقت تک ہتھیار ہاتھ سے نہیں رکھا کہ سرحد سے بہت دور تک میدان صاف نہیں ہو گیا تھا۔ اب دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی تھی، مگر یہ اندیشہ باقی تھا کہ کہیں پھر اکٹھی ہو کر میدان کا رُخ نہ کرے۔ تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ بانس کے نیزہ کی ہیبت دشمنوں پر خوب چھا گئی ہے جس طرف رُخ کرتا تھا، اُسے دیکھتے ہی کلمۂ فرار پڑھتے تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ عرصہ تک اُسے کمرہ میں رہنے دیا جائے۔ اگر کسی اِکا دُکا حریف نے رُخ کرنے کی جرأت بھی کی، تو یہ سر بفلک نیزہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگنے پر مجبور ہو جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سب سے بڑا گھونسلا منھ دھونے کی ٹیبل کے اوپر تھا۔ بانس اس طرح وہاں کھڑا کر دیا گیا کہ اس کا سرا ٹھیک گھونسلے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب گو مستقبل اندیشوں سے خالی نہ تھا، تاہم طبیعت مطمئن تھی کہ اپنی طرف سے سروسامانِ جنگ میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ میر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے، تاہم موقعہ کا تقاضا ٹالا بھی نہیں جا سکتا:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے، ولے اے میر!
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

اب گیارہ بج رہے تھے، میں کھانے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا، تو کمرہ میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کے رہ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سارا کمرہ پھر حریف کے قبضہ میں ہے، اور اس اطمینان و فراغت سے اپنے کاموں میں مشغول ہیں، جیسے کوئی حادثہ

پیش آیا ہی نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جس ہتھیار کی ہیبت پر اس درجہ بھروسا کیا گیا تھا، وہی حریفوں کی کامجوئیوں کا ایک نیا آلہ کار ثابت ہوا۔ بانس کا سرا جو گھونسلے سے بالکل لگا ہوا تھا، گھونسلے میں جانے کے لیے اب دہلیز کا کام دینے لگا ہے۔ تنکے چوں چوں کرلاتے ہیں اور اس نوتعمیر دہلیز پر بیٹھ کر بہ اطمینانِ تمام گھونسلے میں بچھاتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چوں چوں بھی کرتے جاتے ہیں۔ عجب نہیں یہ مصرع گنگنا رہے ہوں کہ:

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

اپنی دہی فتحمندیوں کا یہ حسرت انگیز انجام دیکھ کر بے اختیار ہمت نے جواب دے دیا۔ صاف نظر آ گیا کہ چند لمحوں کے لیے حریف کو عاجز کر دینا تو آسان ہے، مگر اُن کے جوشِ استقامت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں؛ اور اب اس میدان میں ہار مان لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا:

بیا کہ، ما سپر انداختیم، اگر جنگ ست!

اب یہ فکر ہوئی کہ ایسی رسم و راہ اختیار کرنی چاہیے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ ایک گھر میں گزارا ہو سکے۔ سب سے پہلے چارپائی کا معاملہ سامنے آیا۔ یہ بالکل نئی تعمیرات کی زد میں تھی؛ پرانی عمارت کے گرنے اور نئی تعمیروں کے سروسامان سے جس قدر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ نکلتا، سب کا سب اسی پر گرتا۔ اس لیے اسے دیوار سے اتنا ہٹا دیا گیا کہ براہِ راست زد میں نہ رہے۔ اس تبدیلی سے کمرہ کی شکل ضرور بگڑ گئی، لیکن اب اِس کا علاج ہی کیا تھا! جب خود اپنا گھر ہی اپنے قبضہ میں نہ رہا، تو پھر شکل و ترتیب کی آرایشوں کی کسے فکر ہو سکتی تھی! البتہ منھ دھونے کے ٹیبل کا معاملہ اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جس گوشے میں رکھا گیا تھا، صرف وہی جگہ اس کے لیے نکل سکتی تھی؛ ذرا بھی اِدھر اُدھر کرنے کی گنجایش نہ تھی۔ مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ بازار سے بہت سے جھاڑن منگوا کر رکھ لیے اور ٹیبل کی ہر چیز پر ایک ایک جھاڑن ڈال دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد انھیں اٹھا کر جھاڑ دیتا اور پھر ڈال دیتا۔ ایک جھاڑن اس غرض سے

رکھنا پڑا کہ ٹیبل کی سطح کی صفائی برابر ہوتی رہے۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ فرش کی صفائی کا تھا لیکن اسے بھی کسی نہ کسی طرح حل کیا گیا۔ یہ بات طے کر لی گئی کہ صبح کی معمولی صفائی کے علاوہ بھی کمرے میں بار بار جھاڑو پھرجانا چاہیے۔ ایک نیا جھاڑو منگوا کر الماری کی آڑ میں چھپا دیا۔ کبھی دن میں دو مرتبہ، کبھی تین مرتبہ، کبھی اس سے بھی زیادہ، اس سے کام لینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں ہر دو کمرے کے پیچھے ایک قیدی صفائی کے لیے دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت جھاڑو لیے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، اور اگر رہ بھی سکتا تو اس پر اتنا بوجھ ڈالنا انصاف کے خلاف تھا۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ خود ہی جھاڑو اٹھا لیا، اور ہمسایوں کی نظریں بچا کے جلد جلد دو چار ہاتھ مار دیے۔ دیکھیے ان ناخواندہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کتنی تنگ کرنی پڑی:

عشق از یں بسیار کرد ست و کند!

ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہو گئی، تو چاہیے کہ پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باورچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا۔ اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں، اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا۔ جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے، دیکھیے، عرفی کا شعر صورت حال پر کیسا چسپاں ہوا ہے:

فتادم دام بر کنجشک و شادم یادِ آں ہمت
کہ گر سیمرغ می آمد بدام، آزاد میکردم!

کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی، اگر ہوئی بھی، تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آ گیا کہ معشوقانِ ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کر جائے:

حور و جنّت جلوہ بر زاہد دہد، در راہِ دوست
اندکے اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

پہلے ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہ گیا ہے:

چہ لطفہا کہ دریں شیوۂ نہانی نیست
عنایتے کہ تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی کبھی دانہ ڈالنے والے پر، کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے، اور کبھی معلوم ہوتا، ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپنے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحّص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھیگی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگیگی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائیگی، اور چہرے پر تفحّص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائیگا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجّبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور یہ ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متفحّص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر اُبھر رہی تھیں:

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہ راست دانوں کی طرف نہیں آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغِ راست مانند کی یہ نمایش دیکھ کر ظہوری کا شعر یاد آگیا:

بگو حدیثِ وفا، از تو باور ست، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیّاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں، جونہی اُن کے قدموں کا رُخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا: نگاہیں دوسری طرف کرلیں، اور

سارا جسم پتھر کی طرح بے حس وحرکت بنالیا، گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے، کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائیگا۔ یہ گویا نازِ حسن اور نیازِ عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں از وبہ رخش داشتم تماشائے
نظر بہ جانبِ ما کرد و شرمسار شدم

خیر، خدا خدا کر کے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے، اور ایک بتِ طناز نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا۔ مگر یہ رُخ بھی کیا تھا قیامت کا رُخ تھا، ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے۔ میں بے حس وحرکت بیٹھا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

بہ ہر کجا ناز سر بر آرد، نیاز ہم پائے کم ندارد
تو و خرامے و صد تغافل، من و نگاہے و صد تمنا

ایک قدم آگے بڑھتا تھا، تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات وتغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جاسکتی: دو قدم آگے بڑھتے، ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

التفات وتغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جرأتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا، سلسلۂ کار کی درازی سے اُکتا کر بیباکانہ قدم اٹھا دیا، اور زبانِ حال سے یہ نعرۂ مستانہ لگاتا ہوا بیک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا کہ:

زدیم بر صفِ رندان و ہر چہ بادا باد:

اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا، جیسے اچانک تمام رُکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی، نہ کسی نگاہ میں تذبذب؛ مجمع کا مجمع بیک دفعہ

دانوں پر ٹوٹ پڑا، اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے، تو کہا جا سکتا ہے، کہ حجاب و تامّل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی، یا یوں کہیے کہ پگھل گئی۔ غور کیجیے، تو اس کارگاہِ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں۔ جب تک یہ نہیں اٹھتا، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں؛ یہ اٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اٹھ گئی:

نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد!

اس بزمِ سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ انھیں کے حصے میں آیا، جو خود بڑھ کر اٹھا لینے کی جرأت رکھتے تھے۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا:

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بیباکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا، کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی، اس مردِ کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے۔ میں نے اس کا نام قلندر رکھ دیا، کیونکہ بید ماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا، اور اس کی وضعِ قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا:

رہے ایک بانکپن بھی بید ماغی میں تو زیبا ہے
بڑھا دو چینِ ابرو پر ادائے کج کلاہی کو

دو تین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا۔ ایک ایک کر کے آتے، اور ایک ایک دانہ چن لیتے۔ کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہو جاتی، تو قلندر آ کر چوں چوں کرنا شروع کر دیتا کہ وقتِ معہود گزر رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے اب اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اٹھ چکا، وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے:

اد گھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنا لیا، اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا۔ فوراً مہمانوں کی نظر پڑی۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آکر منھ مارنے لگا، کوئی ڈھکنے کے کنارے پر چڑھ کر زیادہ جمعیت خاطر کے ساتھ چگنے میں مشغول ہو گیا۔ آپس میں رقیبانہ ردّوکد بھی ہوتی رہی۔ جب دیکھا کہ اس طریق ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہو گئی ہیں، تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا۔ تیسرے دن اور زیادہ ہٹا دیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ دیکھیے، بُعد و قرب کے معاملہ نے عُلیہ بنت المہدی کا مطلع یاد دلا یا:

وَحَبِّب، فَانّ الحُبَّ داعیۃ الحُبِّ
وَکَم مِن بَعِیدِ الدّارِ مُستَوجِبُ القُربِ

اتنا قرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامّل ہوا۔ دری کے پاس آگئے، مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب بول رہا تھا۔ لیکن اتنے میں قلندر اپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا آ پہنچا اور اس کی رندانہ جرأتیں دیکھ کر سب کی جھجک دُور ہو گئی۔ گویا اس راہ میں سب قلندر ہی کے پیرو ہوئے۔ جہاں اس کا قدم اُٹھا سب کے اُٹھ گئے۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا۔ پھر سر اُٹھا کے اور سینہ تان کے زبانِ حال سے مترنم ہوا:

وَمَا الدّھرُ الّا مِن رُوَاۃِ قَصَائِدِی
اِذا قُلتُ شِعراً، اَصبحَ الدّھرُ مُنشِدا

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو پھر ایک قدم اور اُٹھایا گیا، اور دانوں کا برتن دری سے اٹھا کے تپائی پر رکھ دیا۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے، اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے اور تپائی کے چکر لگا کے چلے جاتے۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا، اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوانِ طرب بنتی، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا۔ جب اس قدر

نزدیک آجانے کے خُوگر ہو گئے، تو میں نے خیال کیا، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک دن صبح کیا کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہو گیا، گویا اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر بر چپ و راست

تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظورِ منی!

تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے کنکھیوں سے دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے، اور بے تکان چونچ مار رہا ہے۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا، اس لیے اس کی دُم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یارانِ تیز گام بھی پہنچ گئے؛ اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقہ، بےتکلف میری بغل میں اچھل کود کرتا رہتا۔ کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا، کبھی کوئی جست لگا کر کتابوں پر کھڑا ہو جاتا، کبھی نیچے اُتر آتا اور چوں چوں کر کے پھر واپس آجاتا۔ بےتکلفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست و خیز کا نشانہ بنانا چاہا، لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے، یا پنجوں سے اُسے چھوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے۔ گویا ابھی معاملہ اس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا، جس کا نقشہ وحشی یزدی نے کھینچا ہے:

ہنوز عاشقی و دلربائیے نہ شدہ است

ہنوز زوری و مرد آزمایے نہ شدہ است

ہمیں تواضع عام ست حسن را با عشق

میانِ ناز و نیاز آشنائیے نہ شدہ است

بہرحال رفتہ رفتہ ان آہوانِ ہوائی کو یقین ہو گیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے۔ دیکھیے، محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کر سکتا، وحشی پرندوں کو رام کر لیتا ہے:

درسِ وفا اگر بُوَد زمزمۂ محبتی
جمعہ بمکتب آورد طفلِ گریز پائے را

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُرکیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا، یا مُنھ سے "ہا" نکل گیا، اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھُرسی آواز سُنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں، تو معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اُچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں، اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔

(۵)

قلعۂ احمد نگر

۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرم

کل جو کہانی شروع ہوئی تھی، وہ ابھی ختم کہاں ہوئی! آیئے، آج آپ کو اس "منطق الطیر" کا ایک دوسرا باب سناؤں۔ معلوم نہیں اگر آپ سنتے ہوتے، تو شوق ظاہر کرتے یا اُکتا جاتے! لیکن اپنی طبیعت کو دیکھتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے داستان سرائیوں سے تھکنا بالکل بھول گئی ہو۔ داستانیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں، ذوقِ داستانسرائی بھی اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

ان یارانِ سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا ایک ہلکا سا پردہ حائل

رہ گیا تھا؛ چند دنوں میں وہ بھی اُٹھ گیا۔

انھیں چھت سے صوفے پر اُترنے کے لیے چند درمیانی منزلوں کی ضرورت تھی۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلی منزل کا کام پنکھے کے دستوں سے لیتے، اور دوسری کا میرے سر اور کاندھوں سے۔ باہر سے اُڑتے ہوئے کمرے میں آئے اور سیدھے اپنے گھونسلے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے سر نکال کر ہر طرف نظر دوڑائی اور پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ پھر وہاں سے اُڑے اور سیدھے پنکھے کے دستے پر پہنچ گئے۔ پھر دستے سے جو کودے، تو کبھی میرے سر کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا، کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزت بخشی۔ دیکھیے، ان چڑیوں نے، نہیں معلوم کتنے برسوں کے بعد مومن خان کا ترکیب بند یاد دلا دیا:

جَولاں کو ہے اس کی قصدِ پامال

اے خاک! نویدِ سر فرازی

پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزولِ اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر ہل گیا تھا۔ قدرتی طور پر ان آشنایانِ زود گسل پر یہ ناقدر شناسی گراں گذری ہوگی! لیکن یہ جو کچھ ہوا محض ایک اضطراری سہو تھا۔ طبیعت فوراً متنبہ ہوگئی، اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بےحس ہو کر رہ گیا کہ منارہ کی چھتری کی جگہ بالاخانے کا کام دینے لگا۔ پنکھے سے اُتر کر سیدھے کاندھے پر پہنچتے، کچھ دیر چہچہاتے اور پھر کود کر صوفے پر پہنچ جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کاندھے سے جست لگائی اور سر پر جا بیٹھے، آپ کو معلوم ہے کہ آتشی قندھاری نے اپنی آنکھوں کی کشتی بنائی تھی؛ بدایونی نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے:

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد، تماشا کن

بیا، در کشتیِ چشمم نشین و سیرِ دریا کن

اور ہمارے سودا کو تامل ہوا تھا:

آنکھوں میں دوں اُس آئینہ رُو کو جگہ، ولے

ٹپکا کرے ہے لسکہ یہ گھر، نم بہت ہے یاں

لیکن میری زبانِ حال کو شیخ شیراز کی التجاے نیاز مستعار لینی پڑی:

گر بر سر و چشم من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، تو خیال ہوا، اب ایک اور تجربہ بھی کیوں نہ کر لیا جائے!۔ ایک دن صبح میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر تک نہیں رکھا۔ مہمانانِ باصفا بار بار آئے، اور جب سُفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا تو ادھر اُدھر چکر لگانے اور شور مچانے لگے۔ اب میں نے برتن نکال کے ہتھیلی پر رکھ لیا اور ہتھیلی صوفے پر رکھ دی۔ جونہی قلندر کی نظر پڑی، معاً جست لگائی اور ایک چکّر لگا کے انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا، اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا۔ اس تیزی میں کچھ تو طبعِ قلندرانہ کا قدرتی تقاضا تھا، اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اُڑ اُڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا، اُس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ ماردی اور ایسی خارا شگاف ماری کہ کیا کہوں، اگر ان ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہو چکا ہوتا، تو یقین کیجیے بے اختیار مُنھ سے چیخ نکل جاتی۔

من گشتۂ کرشمۂ مژگاں کہ بر جگر خنجر زد آں چناں کہ نگہ را خبر نہ شد

اب میں نے ہتھیلی برتن سمیت اوپر اُٹھالی اور ہوا میں معلّق کر دی۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دوسری چڑیا آئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا نام مَوتی ہے۔ موتی نے ہتھیلی کے اوپر ایک دو چکّر لگائے اور نکل گئی۔ گویا اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اس جزیرے پر اُترنے کے لیے محفوظ جگہ کونسی ہوگی۔ پھر دوبارہ آئی اور کُہنی کے پاس اُتر کر سیدھی پہنچے تک پہنچ گئی، اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنائے پر اُتر کر بے تکان "منقار درازیاں" شروع کر دیں۔ اس میں کوئی دانہ قاب کے باہر گر گیا، تو چونچ کا ایک نشتر اس پر بھی لگا دیا۔ دیکھیے "دست درازی" کی ترکیب میں تصرّف کر کے مجھے "منقار درازی" کی ترکیب وضع کرنی پڑی۔ جانتا ہوں کہ محاورات میں تصرّفات کی گنجائش نہیں ہوتی، مگر کیا کیا جائے، سابقہ ایسے یارانِ کوتہ آستین سے آپڑا، جو ہاتھ کی جگہ مُنھ سے

"دراز دستیاں" کرتے ہیں:

دراز دستی اس کوتہ آستیناں ہیں!

لیکن اس آخری تجربے نے طبع کاوش پسند کو ایک دوسری ہی فکر میں ڈال دیا۔ ذوق عشق کی اس کوتاہی پر شرم آئی کہ ہتھیلی موجود ہے اور میں نامراد ٹین کے ڈھکنے پر ان منقاروں کی نشتر زنی ضائع کر رہا ہوں۔ میں نے دوسرے دن ٹین کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ چاول کے دانے ہتھیلی پر رکھے، اور ہتھیلی پھیلا کر صوفے پر رکھ دی۔ سب سے پہلے موتی آئی، اور گردن اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا! یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوبصورت چڑیا ہے۔ آج کل حسن کی نمائشوں میں خوبروئی اور دلاویزی کا جو فتنہ گر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے، اسے پورے ملک کی نسبت سے موسوم کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے مس انگلینڈ، مادموازیل (Mademoiselle) فرانس۔ گویا ایک حسین چہرے کے چمکنے سے سارے ملک و قوم کا چہرہ دمک اٹھتا ہے:

کنند خویش و تبار از تو ناز و می زیبد

بہ حسنِ یک تن اگر صد قبیلہ ناز کنند

اگر یہ طریقہ موتی کے لیے کام میں لایا جائے، تو اُسے مادام قلعۂ احمد نگر سے موسوم کر سکتے ہیں:

این نگاہیست کہ شایستہ دیدار ہمست

چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دُم اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولا پن۔ جب دانہ چگنے کے لیے آئیگی، تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائیگی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں، مگر نگاہیں گویا ہوگئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے، میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ ہا، وحشی یزدی نے ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہا ہے:

کرشمہ گرمِ سوال ست، لب مکن رنجہ

کہ احتیاج بہ پرسیدنِ زبانی نیست

بہر حال اس موقعے پر بھی اس کی بیساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا، اور پھر بغیر کسی جھجک کے جست لگا کے انگوٹھے کی جڑ پر آ کھڑی ہوئی اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کر دیا۔ یہ چونچ نہیں تھی، نشتر کی نوک تھی، جو اگر چاہتی، تو ہتھیلی کے آر پار ہو جاتی، مگر صرف چرکے لگا کے رک جاتی تھی:

یک ناوکِ کاری زکمان تو نخوردم
ہر زخمِ تو محتاج بہ زخمِ دگرم کرد

ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی تھی۔ گویا پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں ہو رہا؟ بھلا، میں جاں باختۂ لذتِ الم اس کا کیا جواب دیتا:

ایں سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

مرزا صائب کا یہ شعر آپ کی نگاہوں سے گذرا ہوگا:

خویش را بر نوکِ مژگانِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست، در خنجر نبود

مجھے اس میں اس قدر تصرف کرنا پڑا کہ مژگان کی جگہ "منقار" کر دیا:

خویش را بر نوکِ منقارِ ستم کیشاں زدم
آں قدر زخمے کہ دل میخواست، در خنجر نبود

درد کا حال تو معلوم نہیں، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی، ہتھیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کے اٹھتی تھی:

رسیدن ہائے منقارِ ہما بر استخواں غالب
پس از عمرے بیادم داد رسم و راہ پیکاں را

اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطع نظر کر لی جائے، تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قلندر اور موتی سے آپ کی تقریب ہو چکی ہے، اب مختصر اً ملا اور صوفی کا حال بھی سُن لیجیے:

ایک چڑا ہے ہی تنومند اور جھگڑالو ہے۔ جب دیکھو، زبان فر فر چل رہی ہے، اور سر اٹھا ہوا

اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے۔ جو بھی سامنے آجائے، دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہیگا۔ کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلّہ کے اندر قدم رکھ سکے۔ کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی، لیکن پہلے ہی مقابلے میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یارانِ شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سرو سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور داہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آموجود ہوتا ہے؛ اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوۂ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں، چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظک جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے:

دی واعظکے آمد در مسجدِ جامع — چوں برف ہمہ جامہ سپید از پا تا سر
چشمش بسوے چپ و چشمش بسوے راست — تا خود کے سلامے کند از منعم و مضطر
زانساں کہ خرامد بہ رسن مردِ رسن باز — آہستہ خرامیدی و موزون و موقر
فارغ نہ شدہ خلق ز تسلیم و تشہد — بر جست چو تو ز بینہ و بنشست بہ منبر
وانگہ بہ سر و گردن و ریش و لب و بینی — بس عشوہ بیاورد، سخن کرد چنیں سر

فرمائیے، اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا؟ ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے، تعرف الاشیاء باضدادہا۔ اُسے جب دیکھیے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے:

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

بہت کیا، تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا، بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے، جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو، اور کبھی کبھی سر اُٹھا کے "ہا" کر دیتا ہو:

تا تو بیدار شوی، نالہ کشیدم، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں، گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آگئے ہیں۔ پھر بھی اس کی زبان کھلتی نہیں۔ البتہ نگاہوں پر کان لگائیے، تو ان کی صداے خاموشی سنی جا سکتی ہے!

تو نظر باز نہ، ور نہ تغافل نگہ ست
تو زباں فہم نہ ور نہ خموشی سخن ست

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تلقب،

جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود!

صبح جب اس بستی کے تمام باشندے باہر نکلتے ہیں، تو برآمدہ اور میدان میں عجیب چہل پہل ہونے لگتی ہے۔ کوئی پھول کے گملوں پر کودتا پھرتا ہے، کوئی کروٹین کی شاخوں میں جھولا جھولنے لگتا ہے۔ ایک جوڑے نے غسل کا تہیہ کیا اور اس انتظار میں رہا کہ کب پھولوں کے تختوں پر پانی ڈالا جاتا ہے۔ جونہی پانی ڈالا گیا، فوراً حوض میں اتر گیا اور پروں کو تیزی کے ساتھ کھولنے اور بند کرنے لگا۔ ایک دوسرے جوڑے کو آس پاس پانی نہیں ملا تو فَتَیَمَّمُوْ صَعِیْداً طَیِّباً پڑھتا ہوا مٹی میں نہانا شروع کر دیا۔ پہلے چونچ مار مار کے اتنی مٹی کھود ڈالی کہ سینے تک ڈوب سکے۔ پھر اس گڑھے میں بیٹھ کر اس طرح پاکوبیاں اور پرافشانیاں شروع کر دیں کہ گرد و خاک کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلے پر ملّا حسبِ معمول کسی حریف سے کشتی لڑنے میں مشغول ہے۔ ان کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی عجیب حال ہوتا ہے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یعنی ہاتھ کو دیکھیے، تو ہتھیار سے یک قلم خالی ہے، بلکہ سرے سے ہاتھ ہے ہی نہیں:

دہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

مگر چونچ کو دیکھیے، تو سارے ہتھیاروں کی کمی پوری کر رہی ہے۔ جوشِ غضب میں آکر اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا۔ گویا "جدالِ سعدی با مدعی در بیانِ توانگری و درویشی" کا منظر آنکھوں میں پھر جائیگا:

او در من و من در و فتادہ!

ہوا میں جب کشتی لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں، تو انہیں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ کہاں گر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے سر پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ ایسا

ہوا کہ ٹھیک میری گود میں آکر گر پڑے، میں نے ایک کو ایک ہاتھ سے، دوسرے کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا:-

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

سارا جسم مٹھی میں بند تھا۔ صرف گردنیں نکلی ہوئی تھیں۔ دل اس زور زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اَب پھٹا، اب پھٹا۔ لیکن اس پر بھی ایک دوسرے کو چونچ مارنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے مٹھیاں کھول دیں، تو پھُر سے اُڑ کر نیچے کے دستے پر جا بیٹھے، اور دیر تک چُوں چُوں کرتے رہے۔ غالباً ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

موتی کے گھونسلے سے ایک بچّے کی آواز عرصے سے آرہی تھی۔ وہ جب دانوں پر چونچ مارتی تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی، اور فوراً گھونسلے کا رُخ کرتی۔ وہاں اس کے پہنچتے ہی بچّے کا شور شروع ہو جاتا۔ ایک دو سکنڈ کے بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گِنا، تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی۔

جن علمائے علم الحیوان نے اس جنس کے پرندوں کے خصائص کا مطالعہ کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ ایک چڑیا دن بھر کے اندر ڈھائی سو سے تین سو مرتبہ تک بچّے کو غذا دیتی ہے۔ اور اگر دن بھر کی مجموعی مقدارِ غذا بچّے کے جسم کے مقابلہ میں رکھی جائے تو اس کا حجم (Mass) کسی طرح بھی بچّے کے جسمانی حجم سے کم نہ ہوگا۔ مگر بچّوں کی قوتِ ہاضمہ اس تیزی سے کام کرتی رہتی ہے کہ اِدھر دانہ اُن کے اندر گیا اور اُدھر تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں کے بچّوں کے نشو ونما کا اوسط چارپایوں کے بچّوں کے اوسط سے بہت زیادہ ہوتا ہے، اور بہت تھوڑی مدّت کے اندر وہ بلوغ تک پہنچ جاتے ہیں۔ موتی کی رفتارِ عمل سے مجھے اس بیان کی پوری تصدیق مل گئی۔

پھر جوں جوں بچّوں کے پَر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے، اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انھیں اڑنے کا سبق سکھانا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے، موتی کے کانوں میں یہ سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں، کہ

گھونسلے سے اڑتی ہوئی اُتری، تو اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پروبال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اُڑنے لگتی۔ لیکن بچے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی، وہ پر پھیلائے، آنکھیں بند کیے، بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے دیکھا تو معلوم ہوا، ابھی پر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں۔ گرنے کی چوٹ کا اثر بھی تازہ ہے، اور اس نے بیحال کر دیا ہے۔ بے اختیار نظیری کا شعر یاد آگیا:

به وصلش تا رسم، صد بار بر خاک افگند شوقم
که نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

بہر حال اسے اٹھا کے دری پر رکھ دیا۔ موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر منہ میں لیتی اور اُسے کھلا دیتی وہ منہ کھولتے ہی چوں چوں کی ایک مدھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود، آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔ پورا دن اسی حالت میں نکل گیا۔ دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی۔ ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اُڑنے کی تلقین کرتی رہی، مگر اس پر کچھ ایسی مُردنی سی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب بچیگا نہیں۔ لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دُور تک چلی گئی تھی یہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا، پر گرے ہوئے پانو مڑے ہوئے، آنکھیں حسبِ معمول بند تھیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے۔ پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا، اور پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا، تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اُڑ کر نظر و ں سے غائب ہو گیا۔ یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہہ ہونے لگا، کہیں کسی دوسری چڑیا کو اُڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ گیا ہوں، لیکن ایک واقعہ جو ظہور میں آچکا تھا، اب اس میں شبہہ کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی! کہاں تو بیحالی اور درماندگی کی یہ حالت کہ دو دن تک ماں سر کھپاتی رہی تھی، مگر زمین

سے بالشت بھر بھی اونچا نہ ہو سکا، اور کہاں آسمان پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اُڑان میں عالم حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضائے لامتناہی کی ناپیدا کنار وسعتوں میں گم ہو گیا! کیا کہوں اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی تھی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا تھا، اور اس جوش و خروش کے ساتھ آیا تھا کہ ہمسایے چونک اُٹھے تھے:

یزدے عشق ہیں کہ دریں دشت بیکراں
گاہے نرفتہ ایم و بپایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا، جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے، مگر ہم اسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس چڑیا کے بچے میں اُڑنے کی استعداد اُبھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، مگر ابھی تک اُس کی "خود شناسی" کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی حقیقت سے بیخبر تھا۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی، ہوا کی لہریں بار بار پَروں کو چھوتی ہوئی گذر جاتی تھیں، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آ کر بڑھاوے دیتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کا چولہا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کر سکتی تھی:

کلیم شکوہ ز توفیق چند، شرمت باد!
تو چوں برہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند

لیکن جونہی اُس کی سوئی ہوئی "خود شناسی" جاگ اُٹھی، اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ "میں اُڑنے والا پرند ہوں" اچانک قالب بیجان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی۔ وہی جسم زار جو بیطاقتی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اب سَرو قد کھڑا تھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے، اب تن کر سیدھے ہو گئے تھے۔ وہی گرے ہوئے پَر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی، اب سمٹ سمٹ کر

اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوشِ پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلا کر اچھال دیا تھا۔ اور پھر جو دیکھا، تو درماندگی اور بیچالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور مرغِ ہمّت، عقاب وار فضائے لاتناہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ ولیتہ درّ ما قال:

بال بکشا و صفیر از شجرِ طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی!

گویا بیطاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری، بے پروبالی سے بلند پروازی، اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہو گیا۔ غور کیجیے، تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے:

طے میشود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے
ما بیخبراں منتظرِ شمع و چراغیم

اڑنے کے سر و سامان میں سے کونسی چیز تھی جو اس نو گرفتارِ قفسِ حیات کے حصے میں نہیں آئی تھی؛ فطرت نے سارا سر و سامان مہیا کر کے اُسے بھیجا تھا، اور ماں کے اشارے دمبدم گرم پروازی کے لیے اُبھار رہے تھے لیکن جب تک اس کے اندر کی "خود شناسی" بیدار نہیں ہوئی، اور اس حقیقت کا عرفان نہیں ہوا کہ وہ طائر بلند پرواز ہے، اس کے بال و پر کا سارا سر و سامان بیکار رہا۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے اندر کی "خود شناسی" بھی جب تک سوئی رہتی ہے، باہر کا کوئی ہنگامہ سعی اُسے بیدار نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی اس کے اندر کا عرفان جاگ اُٹھا، اور اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے، تو پھر چشم زدن کے اندر سارا انقلابِ حال انجام پا جاتا ہے، اور ایک ہی جست میں حضیضِ خاک سے اُڑ کر رفعتِ افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔ خواجۂ شیراز نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

چہ گویمت کہ بمے خانہ دوش مست خراب | سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہ ہا داد است
کہ اے بلند نظر، شاہبازِ سدرہ نشیں! | نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد است

تراز کنگرۂ عرش می‌زنند صفیر   ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادہ است۔

ابوالکلام

(۶)

قلعۂ احمد نگر

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء

آنچہ دل از فکرِ آں میسوخت، ہم ہجر بود
آخر از بے مہریٔ گردوں باآں ہم ساختیم

صدیقِ مکرّم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں، بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا، لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا، کمرہ میں آیا، روشنی کی، اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ اِن آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں، یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے؛ اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اسی طرح گزرینگی:

دماغ بر فلک و دل بپائے ہر بتاں
چگونہ حرف زنم؛ دل کجا، دماغ کجا!

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ اُن میں ساری باتیں ہوتی تھیں، لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا، تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی

میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آرہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہوگئی:

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا، مگر طوفانی آثار ہر طرف امنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی، یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائیگا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائیگا۔ [a] یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اور وہ اُن سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے، میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم ملا۔

---

[a] گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے، اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کرکے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لیے گئے تھے۔ لیکن پھر رائے بدل گئی، اور بالآخر طے پایا کہ قلعہ احمدنگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا، وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی؛ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے، اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی۔ لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے، اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا، تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی، تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا:

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اُس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں، تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اِس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اِس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا؛ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب کا اظہار ہوگا، تو مجھے سخت ناگوار گزریگا، اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلّقات میں باقی رہیگی۔ ۱۹۱۶ میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی، تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی، اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا، اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف

ساتھ ہی نہیں دیا، بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار وعقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقعہ پر اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط وکتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۷ ستمبر کو مجھے اُس کا پہلا خط ملا اور اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کریگی، اس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لیے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھّی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورتِ حال دریافت کی، تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی بات نہیں۔

۲۲ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلیگرام اُسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلیگرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا، وہ کس تاریخ کا تھا، اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچادینی چاہیے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے۔ اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جاسکتا ہے، نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئیگا، تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئیگا۔ اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائیگا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جاسکتی۔ اگر تار بھیجنا ہوا، تو اُسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجیگا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اُسے آگے

روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے، اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا؛ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا، وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا، اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے، تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا، ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے، اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا، اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، تو وہ اُسے فوراً بمبئی بھیج دیگا، اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑیگی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا، اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہرلال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی، جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومتِ بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جونہی خطرناک صورتِ حال کی خبر ملی، میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے

نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمّہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گذری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا، ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے، اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدّ وجہد کرنی پڑیگی۔ یہ جدّ وجہد دماغ کو نہیں، مگر جسم کو تھکا دیتی ہے؛ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرلوں۔ اِس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا، لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے، جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں، ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چاے اور کھانے کے چار وقت ہیں، جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں، اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی، اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے، لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی، اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم

کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔
اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرہ کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا کمرہ میں آتا ہے۔ جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملیگی، لیکن پھر فوراً چونک اٹھتا میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف ہے۔ اس لیے جب تک ایک آدمی اندر آکے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا، تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں، جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا، اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و قرار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے:

بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فَاِنَّ مَا تَحْذَرِیْنَ، قَدْ وَقَعَ!

دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالے کیا، جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی، اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا، لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔
اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا، اُس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں، تو قدرتی طور پر انھیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں، لیکن جونہی انھیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اُسی دیوار کی اوٹ سے۔ مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں،

غافل نیَم ز راہِ و لے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ میزنند

یہاں احاطے کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے، جب سے آیا ہوں، سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اُسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے ایک نئی طرح کا اُنس اُس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ اور متمم بن نُویرہؓ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آگیا:

لَقَدْ لَامَنِی عِنْدَ الْقُبُوْرِ عَلَی الْبُکَا — رَفِیْقِی لِتَذْرَافِ الدُّمُوْعِ السَّوَافِکِ
فَقَالَ أَتَبْکِی کُلَّ قَبْرٍ رَأَیْتَهٗ — لِقَبْرٍ ثَوٰی بَیْنَ اللِّوٰی فَالدَّکَادِکٗ
فَقُلْتُ لَهٗ إِنَّ الشَّجَا یَبْعَثُ الشَّجَا — فَدَعْنِی، فَهٰذَا کُلُّهٗ، قَبْرُ مَالِکٍ

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے، تو بول اُٹھتے:

سوداؔ! خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی، تیرے فسانے میں

ابو الکلام